سلسلہ مطبوعات ۲۷۶

سلسلۂ ابوالکلام آزاد صدی تقریبات

ابوالکلام آزاد

اترپردیش اردو اکادمی

لکھنؤ

اترپردیش اُردو اکادمی، لکھنؤ کی مجلسِ عام کے اراکین

ریاستی حکومت نے [illegible] کو اترپردیش اردو اکادمی کی مجلس عام کے لیے جن اراکین کو نامزد کیا تھا، ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

نام	مقام	نام	مقام	نام	مقام
بیگم حامدہ حبیب اللہ	لکھنؤ (صدر)	حافظ محمد صدیق	دہلی	جناب ویریندر پرشاد سکسینہ	بدایوں
پروفیسر محمود الٰہی	گورکھپور	جناب اسرار احمد	بدایوں	ڈاکٹر سید عبدالباری	سلطان پور
ڈاکٹر امیر اللہ خاں شاہین	میرٹھ	خواجہ محمد رائق	لکھنؤ	جناب راجیندر بہادر موج	فتح گڑھ
پروفیسر حکم چند نیر	وارانسی	پروفیسر ولی الحق انصاری	لکھنؤ	ڈاکٹر سید محمد امین	آگرہ
پروفیسر سید محمد عقیل رضوی	الٰہ آباد	جناب اقبال صدیقی	لکھنؤ	جناب انجم عرفانی	گونڈہ
پروفیسر قاضی عبدالستار	علی گڑھ	سید جاوید علی	گورکھپور	ڈاکٹر سعید عارفی	بہرائچ
پروفیسر سید شبیہ الحسن	لکھنؤ	جناب امتیاز محمد خاں	بلند شہر	مولانا صادق علی	بستی
جناب عبدالرحمٰن خاں نشتر	لکھنؤ	جناب افسر احمد	بستی	جناب پربھان شنکر سروش	اُناؤ
ڈاکٹر بشیشر پردیپ	لکھنؤ	جناب سراج فیض آبادی	لکھنؤ	جناب خمار بارہ بنکوی	بارہ بنکی
جناب ایم. کوٹھیاوی راہی	گورکھپور	جناب خلیل الرب	علی گڑھ	ڈاکٹر ظہیر احسن	متھرا
جناب عشرت علی صدیقی	لکھنؤ	محترمہ انوار اطہر رضوی	علی گڑھ	ڈاکٹر احسن رضوی	فیض آباد
جناب صباح الدین عمر	لکھنؤ	حافظ محمد عمر	کانپور	ڈاکٹر صبیحہ انور	لکھنؤ
جناب اطہر نبی	لکھنؤ	پروفیسر عنوان چشتی	دہلی	جناب عالم فتح پوری	آگرہ
جناب خان غفران زاہدی	کانپور	جناب عمر قریشی	گورکھپور	مولانا اسحاق سنبھلی	مرادآباد
جناب بیکل اُتساہی	گونڈہ	جناب ناصر فاخری	الٰہ آباد	جناب جلیل فتح پوری	کانپور
جناب نذیر بنارسی	وارانسی	ڈاکٹر فہمیدہ کبیر	رامپور	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	لکھنؤ
مولانا جلال الدین عبدالمتین	لکھنؤ	جناب بخشی رام الفت	سہارنپور	سردار کرم جیت سنگھ	لکھنؤ
ڈاکٹر بشیر بدر	میرٹھ	جناب منصور علی خاں	سہارنپور	جناب عزیز الرحمٰن	کانپور
جناب کامل قدوائی	لکھنؤ	جناب محبوب الرحمٰن	گورکھپور	جناب حق بنارسی	کانپور
پروفیسر نورالحسن ہاشمی	لکھنؤ	مولانا زاہد	سہارنپور	ڈاکٹر مہ لقا اعجاز	کانپور
ڈاکٹر محمد عرفان	اعظم گڑھ	جناب وامق جونپوری	جون پوری	جناب ذکی طارق	میرٹھ

سکریٹری محکمۂ قومی یک جہتی، حکومت اترپردیش
سکریٹری محکمۂ تعلیمات ، حکومت اترپردیش
سکریٹری محکمۂ مالیات، حکومت اترپردیش
ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) محکمۂ تعلیمات ، اترپردیش
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات ، حکومت اترپردیش
کارگزار نائب صدر ، ہندی سنستھان، لکھنؤ
رام کرشن ورما، سکریٹری، یو.پی اردو اکادمی، لکھنؤ

اُترپردیش اُردو اکادمی لکھنؤ کی مجلسِ انتظامیہ

ریاستی حکومت نے ۱۸ جون ۱۹۸۷ء کو اترپردیش اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ کے لیے جن
اراکین کو نامزد کیا تھا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

پروفیسر محمود الٰہی	صدر شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی	گورکھپور (چیرمین)	جناب خان غفران زاہدی	ایم۔ایل۔اے	کالا بازار
ڈاکٹر میر اشفاق شاہین	صدر شعبۂ اردو، میرٹھ کالج	میرٹھ (وائس چیرمین)	جناب جمیل انصاری	ایم۔پی	گونڈہ
پروفیسر حکم چند نیر	صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی	وارانسی	جناب نذیر بنارسی	دوشی پورہ	وارانسی
پروفیسر سید محمد عقیل رضوی	صدر شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی	الٰہ آباد	مولانا جلال الدین عبدالمتین	فرنگی محل	لکھنؤ
پروفیسر قاضی عبدالستار	صدر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی	علی گڑھ	ڈاکٹر بشیر بدر	میرٹھ کالج	میرٹھ
پروفیسر سید شبیہ الحسن	صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی	لکھنؤ	جناب کامل قدوائی	اے، ۹۹۲ راجہ جی پورم	لکھنؤ
جناب عبدالرحمٰن خاں نشتر	نائب صدر، ریاستی قومی یکجہتی پریشد	لکھنؤ	سکریٹری محکمۂ تعلیمات، حکومت اترپردیش		
ڈاکٹر شیشر ہمدیپ	اے۔ ۱۰۰۰۰، اندرا نگر کالونی	لکھنؤ	سکریٹری محکمۂ قومی یکجہتی، حکومت اترپردیش		
جناب ایم۔ کوٹھیاوی راہی	مدیر ماہنامہ اشتراک	گورکھپور	سکریٹری محکمۂ مالیات، حکومت اترپردیش		
جناب عشرت علی صدیقی	چیف ایڈیٹر، روزنامہ قومی آواز	لکھنؤ	ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) محکمۂ تعلیمات، اترپردیش		
جناب صباح الدین عمر	۳۰ نعمت اللہ روڈ، امین آباد	لکھنؤ	کارگزار نائب صدر، ہندی سنستھان، ہندی بھون		
جناب اطہر نبی	ایڈوکیٹ، بی۔ این۔ سانیال روڈ	لکھنؤ	رام کرشن ورما، سکریٹری، اترپردیش اردو اکادمی		

اترپردیش اردو اکادمی کی مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات سب کمیٹی

اترپردیش اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ نے "مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات سب کمیٹی" کی تشکیل کی
ہے۔ اراکین کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

پروفیسر محمود الٰہی (چیرمین مجلس انتظامیہ)
جناب عبدالرحمٰن خاں نشتر
پروفیسر سید شبیہ الحسن
پروفیسر حکم چند نیر
ڈاکٹر بشیر بدر

جناب ناصر فاخری
جناب صباح الدین عمر
سکریٹری محکمۂ مالیات، حکومت اترپردیش
سکریٹری محکمۂ قومی یکجہتی، حکومت اترپردیش

خصوصی مدعوعین :

محترمہ نجمہ ہپت اللہ (رکن پارلیمنٹ) نئی دہلی
ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری، پٹنہ
پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر
جناب احمد سعید ملیح آبادی، مدیر آزاد ہند، کلکتہ

پیش لفظ

جون ۱۹۸۷ء میں جب اتر پردیش اردو اکادمی کی تشکیل نو ہوئی اور میں کوئی چار سال کے وقفے کے بعد اس کی مجلس انتظامیہ کا ایک بار پھر چیرمین نامزد کیا گیا تو میرے ذہن نے اس کا جو ترجیحاتی منصوبہ مرتب کیا، اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی صد سالہ جشن ولادت کی تقریبات کو سرفہرست جگہ ملی، اور سچ بات تو یہ ہے کہ میں کسی طرح یہ عہدہ قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا لیکن چھ ماہ کی طویل کشمکش کے بعد میرے انداز فکر میں تبدیلی رونما ہوئی اور اس جذبے نے میری انفعالی کیفیتوں کو شکست دے دی کہ مولانا کی شخصیت اور ان کی تعلیمات کو عام کرنا ہمارے واجبات میں ہے اور اردو اکادمی اس قومی کام میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔

میں نے جب اکادمی کی مجلس انتظامیہ کے اراکین سے آزاد صدی کے مختلف پہلوؤں پر غیر رسمی گفتگو کی تو ان کے اندر اس منصوبے کی تکمیل کا ذوق مجھ سے کہیں زیادہ ملا اور آخر کار مجلس انتظامیہ نے اپنی پہلی نشست میں الہلال کی مکمل فائلوں کے عکس کی طباعت واشاعت کا منصوبہ بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ منظور کر لیا۔ مجلس انتظامیہ نے محسوس کیا کہ مولانا آزاد کو اس سے زیادہ مخلصانہ خراج عقیدت اور کیا ہوگا کہ الہلال کا عکس ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا جائے۔

اکادمی کا سالانہ بجٹ محدود اور متعین ہوتا ہے۔ اس کی مدیں مقرر ہیں اور ریاستی حکومت ان مدوں کے پیش نظر ہر سال گرانٹ دیتی ہے۔ آزاد صدی کا بجٹ الگ سے مرتب کیا گیا اور حکومت کو منظوری اور اضافی گرانٹ کے لیے بھیج دیا گیا۔

بجٹ، ضمنی بجٹ، گرانٹ، اضافی گرانٹ، متواتر اور غیر متواتر گرانٹ ـــــــ یہ ایسے موضوعات ہیں جن کی جزئیات ہمیشہ میرے دائرہ فہم سے باہر رہی ہیں۔ ایک مدت تک جب اضافی گرانٹ کے سلسلے میں حکومت سے کوئی جواب نہیں ملا اور اکادمی کے افسروں نے اس کے مالہ وماعلیہ کی تفصیلات مجھے بتائیں تو میرے شب و روز کے معمولات متاثر ہو گئے اور کچھ میں نہیں آتا تھا کہ الہلال کے عکس کی اشاعت کیوں کر ممکن ہوگی۔ عوام و خواص سے کسی طرح کا چندہ وصول کرنا ہمیشہ اور ہر حال میں میرے معمولات سے خارج رہا ہے۔ جب کوئی راستہ نظر نہیں آیا تو میں نے گرانٹ کی منظوری کی توقع پر کام کا آغاز کر دیا۔

اسی اثنا میں گورکھپور ایئرپورٹ پر جناب ویر بہادر سنگھ (سابق وزیر اعلیٰ) سے ملاقات ہو گئی اور میں نے آزاد صدی کا ذکر چھیڑ دیا۔ انھوں نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ اتر پردیش میں "آزاد صدی تقریبات" اس طرح منائی جائیں جو ہر لحاظ سے مولانا آزاد کے شایان شان ہوں۔ انھوں نے اضافی گرانٹ کے سلسلے میں کہا کہ اس کی فکر نہ کیجیے، لکھنؤ آ جائیے، گرانٹ مل جائے گی۔ میں نے ۲۲ مارچ ۱۹۸۸ء کو جب شری ویر بہادر سنگھ سے لکھنؤ میں ملاقات کی تو انھیں ایئرپورٹ والی بات یاد آ گئی۔ بجٹ کے جو کاغذات اکادمی سے بھیجے گئے تھے، ابھی ان کی نظر سے نہیں گذرے تھے مگر انھوں نے بطیب خاطر ایک دوسرے کاغذ پر پانچ لاکھ کی رقم منظور کی اور کہا کہ جتنی مزید رقم کی ضرورت ہوگی، حکومت ادا کرے گی۔

جون ۱۹۸۸ء میں جناب نراین دت تیواری نے وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۰ جولائی ۱۹۸۸ء کو اکادمی کی مجلس عام کا اجلاس منعقد ہوا جس میں تیواری جی نے بھی شرکت کی۔ اکادمی کی صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ نے آزاد صدی تقریبات کے لیے مزید پانچ لاکھ کی رقم کا مطالبہ کیا۔ تیواری جی نے اسی اجلاس میں اس مطالبے کو منظور کر لیا اور اس طرح آزاد صدی تقریبات کے لیے ریاستی حکومت نے مجموعی طور پر دس لاکھ روپے کا عطیہ منظور کیا۔

الہلال کے عکس کی اشاعت کوئی اہمیت رکھتی ہے کہ نہیں، اس سوال کا جواب ــــ منفی تو ہرگز نہیں۔ ہمارے سامنے اس کے بہت سے مثبت پہلو ہیں۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ مولانا آزاد پر کوئی تحقیقی اور تنقیدی کام اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک الہلال کے سارے شماروں کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کر لیا جائے۔ مولانا آزاد کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں صرف اس لیے راہ پا گئی ہیں کہ الہلال کی فائلیں نایاب ہیں اور خواہش کے باوصف لوگوں کو اس کے مطالعے کا موقع نہیں ملا۔ الہلال مولانا کی دینی، سیاسی، علمی اور ادبی شخصیت کا حرف آغاز بھی ہے اور حرف آخر بھی۔

ان موضوعات کا کون سا ایسا نکتہ ہے جس کی تصریح الہلال میں نہیں ہے۔ آزاد اور الہلال لازم و ملزوم ہیں اس لیے اگر آزاد صدی کے موقع پر بھی مولانا آزاد کا مطالعہ ادھورا رہ جاتا تو موجودہ نسل ہمیشہ مورد الزام رہتی کہ وہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہوئی۔ اتر پردیش اردو اکادمی اس الزام سے اپنے معاصرین کو بری کر رہی ہے۔

الہلال کسی الف لیلوی داستان کے زمرے میں شامل ہوتا جا رہا ہے۔ اردو کے مختلف ادبیات کے نصاب میں مولانا آزاد کی تحریریں بجا طور پر شامل کی گئی ہیں اور جب اساتذہ ان تحریروں پر درس دیتے ہیں تو الہلال اور اس کی گوناگوں خصوصیات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ طلبہ کے اندر الہلال کے دیدار کی خواہش بیدار ہو جاتی ہے۔ مگر اساتذہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتے کہ الہلال ایک جنس نایاب ہے۔ اگر کہیں کسی کے پاس کوئی شمارہ ہے بھی تو وہ اتنے پراسرار طریقے سے اس کی جلوہ گری کا سامان بہم کرتا ہے کہ یہ جلوہ گری "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے" کے ذیل میں آ جاتی ہے۔ الہلال کے عکس کی اشاعت سے نئی نسل کی شکایت دور ہو جائے گی۔ کم از کم اتنا دعویٰ تو وہ کر سکتی ہے کہ اس الہلال کو نہ سہی اس نے اس کا عکس تو دیکھا ہے۔ الہلال کی یہ نئی جامہ پوشی اس کے انداز و قد کی بہر حال غمازی کرے گی۔

اسلاف علم و ہنر اور بیم ورجا کے مابین جو امتیازی لکیر کھینچتے آئے ہیں، اس کی حقانیت کا بارہا تجربہ ہوا لیکن الہلال کی فائلوں کی تلاش نے اسے آئینہ کر دیا۔ اس کی اشاعت کے لیے ریاستی حکومت سے گرانٹ قبول کی گئی لیکن اس کے صحیح سالم اوراق کی فراہمی مرحلۂ جوئے شیر ثابت ہوا۔ میں ۱۹۸۵ء میں گورکھپور آ گیا تھا اور برابر یہاں کے ذاتی کتب خانوں کی تلاش اور ان سے استفادے میں مصروف رہا۔ بعض ذاتی کتب خانوں کی فہرستیں بھی میں نے مرتب کر لی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ الہلال کے سارے شمارے مجھے گورکھپور میں مل جائیں گے اور اگر دو چار شماروں کی کمی ہوگی تو وہ باہر کے کتب خانوں سے پوری ہو جائے گی میرے۔ اس یقین نے دھوکا نہیں دیا، قریب قریب سارے شمارے یہاں مل گئے بلکہ بعض بعض شماروں کی تو چھ چھ کاپیاں ملیں لیکن دستبرد زمانہ نے ان شماروں کی جو گت بنا دی تھی، اس نے میرے عزم و حوصلے کو متاثر کر دیا۔ کسی کا سرورق غائب ہے، کسی کے بیچ کے صفحات غیر حاضر، بعض فائلیں ناقص الاول، بعض ناقص الآخر اور بعض ناقص الطرفین نکلیں۔ بعض شماروں سے تصویریں غائب تھیں ـــــ اور المیہ کی حد یہ تھی کہ بعض شماروں کے ایک کالم کو دیمک چاٹ گئی تھی اور بعض کے دوسرے کالموں کو۔ غرض الہلال کی دستیابی کی جہاں خوشی تھی وہاں اس کا غم تھا کہ اس کا عکس کیوں کر لیا جائے گا۔

بہت سی تدبیریں اور ترکیبیں ذہن میں آئیں لیکن میں نے یہ کیا کہ سب سے پہلے سارے شماروں کے کارڈ بنا لیے اور اس کے اندراجات اس طور پر مکمل کیے جن سے بعض علمی اشارات کی نشاندہی بھی ہو جائے اور عاریت دینے والوں کے نام اور شماروں کی ہیئت کذائی بھی واضح ہو جائے۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے میں نے سارے شماروں کے الیکٹرواسٹیٹ عکس حاصل کر لیے۔ اصل مرحلہ اس کے بعد پیش آیا جسے میں تنہا طے نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اپنی بیوی کے سامنے مسائل رکھے اور اس سے کہا کہ میں چند دو ہفتے کے لیے سارے گھر کو اس کام میں لگانا چاہتا ہوں۔ تم ایسا کرو کہ گھر کے معمولات میں فرق بھی نہ آئے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق گھر کا ہر فرد اس کام میں میری مدد بھی کرے۔ ماں کا حکم ہوا تو میرا بیٹا مشہود اور بیٹیاں عذرا، بشریٰ، قدسیہ، فوزیہ اور زیبا الہلال کے کام میں لگ گئیں۔ سارا گھر الہلال کی اصل فائلوں اور ان کی الیکٹرواسٹیٹ کاپیوں سے بھر گیا۔ کرسیوں پر، میزوں پر، فرش پر، ہر جگہ الہلال کے شمارے بکھرے ہوئے تھے اور اللہ کا نام لے کر ہم سب نے ہر شمارے کے ایک ایک ورق کو دیکھنا شروع کیا اور جہاں کوئی نقص نظر آتا اسے فوراً اسی شمارے کی دوسری کاپیوں کی مدد سے درست کر لیا جاتا۔ اس کی صورت یہ اختیار کی گئی کہ متاثرہ عبارت پر صاف عبارت والا فوٹو چپکا دیا جاتا اور پھر اس طرح کے اوراق کا دوبارہ الیکٹرواسٹیٹ کرایا جاتا تاکہ اس کی نگیٹیو بننے میں دشواری نہ ہو۔ دن بھر بلیڈ سے کاٹ کاٹ کر زخمی اوراق پر پھایہ مرہم رکھا جاتا اور شام کو ان کا الیکٹرواسٹیٹ کرایا جاتا۔ صبح کو تین چار بجے جب میں سو کر اٹھتا تو ان نئے اوراق کا حرفاً حرفاً مطالعہ کرتا اور اوریجنل سے موازنہ کرتا کہ کہیں کوئی نقطہ یا حرف متاثر تو نہیں ہو گیا ہے۔

ہر چند ہم نے کوشش کی ہے کہ الہلال کا ایک ایک لفظ اصل حالت میں قارئین کے سامنے آ جائے لیکن ہم انسان ہیں، ہم سے ضرور غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، ہم عفو اور درگذر کے مستحق ہیں۔

جن لوگوں نے الہلال کی فراہمی اور اس کی ترتیب میں میری مدد کی ہے ان کا شکریہ ادا کرنا میرے واجبات میں داخل ہے۔ احسان کرنے والوں کی فہرست بہت طویل ہے لیکن جن لوگوں کے احسانات مجھے ہر موقع پر اور ہر حال میں یاد رہیں گے، ان میں سب سے پہلے جناب مصطفیٰ کمال، اسسٹنٹ لائبریرین، گورکھپور کا نام آتا ہے۔ موصوف ایم۔ اے میں میرے شاگرد رہ چکے ہیں، انھوں نے الہلال کی فراہمی میں بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ روزنامہ قومی آواز کے سب ایڈیٹر جناب قطب اللہ نے الہلال کے بعض شمارے صرف فراہم نہیں کیے بلکہ گمشدہ ٹکڑے دے کر ان کی فوٹو کاپیاں کرائیں۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے بھی بعض شماروں کی فراہمی میں بروقت مدد کی۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ الہلال کی ایک فائل میرے پاس بھجوا دی۔ میں ان سب کا اپنی طرف سے اور اکادمی کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض الدین اور ڈاکٹر تحریر انجم نے فہرست سازی اور ترتیب میں غیر معمولی دلچسپی لی، ڈاکٹر محمد شعیب نے کتابت اور تزئین کا بار سنبھالا۔ یہ تینوں میرے شاگرد رہ چکے ہیں، شاگرد بھی اولاد کا درجہ رکھتے ہیں لیکن ان کا شکریہ ادا کیے بغیر میں اپنے فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

یہ کام مجلس انتظامیہ کے فیصلے سے انجام پذیر ہوا ہے۔ اس نے مجھے جو حکم دیا، میں نے اس کی تعمیل کی۔ میں مجلس انتظامیہ کے ہر رکن کا فرداً فرداً شکریہ ادا کر رہا ہوں۔

آزاد صدی تقریبات کے لیے مجلس انتظامیہ نے جس سب کمیٹی کی تشکیل کی تھی، اس میں ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، جناب احمد سعید ملیح آبادی، چیف ایڈیٹر آزاد ہند، کلکتہ اور پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی، صدر شعبۂ اسلامیات، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر خصوصی مدعوین کی حیثیت سے شامل کیے گئے تھے۔ ان حضرات کے سرگرم تعاون کو اکادمی ہمیشہ یاد رکھے گی۔

اگر الہلال کے اس عکسی ایڈیشن کی پذیرائی ہوئی تو جناب سید ظہیر مسعود رضوی، نیپکن کمشنر اور جناب رام کرشن درما، سکریٹری اکادمی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ طباعت و اشاعت کا سارا بار انھوں نے اٹھایا تھا۔ اس میں جو خامیاں ہیں تو صدق دل سے میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ مجھ سے سرزد ہوئی ہیں، میں آنامز و یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنے احساس فرض کو کبھی مرنے نہیں دیا۔ میں نے اپنی علمی زندگی کی تشکیل میں مولانا آزاد کی تحریروں سے ہمیشہ کام لیا۔ میری خواہش رہی ہے کہ نئی نسل بھی ان تحریروں سے استفادہ کرے۔ الہلال کی اشاعت دیں مجھے اس خواہش کی تکمیل کے آثار نظر آتے ہیں!

محمود الٰہی
چیرمین، مجلس انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکادمی
قیصر باغ، لکھنؤ
یکم اگست ۱۹۸۸ء

پروفیسر محمود الٰہی

مقدمہ

گزشتہ ۵۰ سال کے عرصے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے "الہلال" کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اس کی معنوی و صوری خوبیوں کے تعلق سے کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل کے ذیل میں شمار ہوگا۔ اس میں اتنی کشش تھی کہ مولانا کے فکری اور سیاسی موقف سے جنھیں اختلاف تھا، وہ بھی معیاری صحافت کے باب میں اس کی اولیت کا اعتراف کرتے تھے۔ "الہلال" کی تعریف و توصیف میں بعض مشاہیر ایسے جملے لکھ گئے ہیں جنھیں ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے، میں یہاں ان خیال انگیز جملوں کا بھی اعادہ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔

میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں اور اسے شاعرانہ مبالغہ پر محمول نہ کیا جائے کہ مولانا آزاد "الہلال" پر خود فریفتہ تھے اور یہ فریفتگی ان کی آخری سانس تک قائم رہی۔ مولانا نے "الہلال" کی اشاعت کے وقت جو سیاسی، مذہبی اور فکری موقف اختیار کیا تھا، اس میں کبھی تزلزل نہیں آیا۔ حالات بدلتے گئے، دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی یہاں تک کہ وہ وقت آگیا جب مولانا کے قویٰ مضمحل ہو گئے اور ایک دنیا (جس میں ان کے بعض مخلص اور ہم خیال افراد بھی شامل تھے) ان کی اصابتِ رائے کو نظر انداز کرنے لگی مگر مولانا اسی موقف پر اصرار کرتے رہے جو انھوں نے پہلے دن اختیار کیا تھا۔ جب کبھی ملک و قوم کو نازک مراحل سے گزرنا پڑا اور ایسے مواقع پر مولانا کو اظہارِ خیال کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے جو کچھ بھی کہا الہلال کے حوالے سے کہا۔ الہلال ایک نسخۂ کیمیا تھا جسے ہر موقع پر وہ قوم کو نذر کر دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔

۲۸ اور ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو کلکتے میں بنگال خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس میں مولانا آزاد نے ایک طویل خطبۂ صدارت پیش کیا تھا جو ترمیم و اضافہ کے بعد "مسئلۂ خلافت و جزیرۂ عرب" کے نام سے مئی ۱۹۲۰ء میں کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا تھا۔ اس خطبے کے بعض اقتباسات یہ ہیں جس میں مولانا نے "الہلال" اور "البلاغ" کو یاد کیا تھا:

"عزیزانِ ملت! اس طول طویل صحبت میں جس قدر باتیں میں نے تم سے کہی ہیں، ان میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر نئی ہو بلکہ یہ تمام وہی باتیں ہیں جو پچھلے دس سالوں سے برابر کہہ رہا ہوں اور اگر الہلال و البلاغ کی پیہم صدائیں تمھارے حافظے میں فراموش نہیں ہو گئی ہیں تو تم اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ تمھارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کر رہا۔ اسی صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوٹ لوٹ کر پکار رہا ہے۔"

۲۵ اگست ۱۹۲۱ء کو مجلس خلافت آگرہ میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"اس مسئلہ جس پر میں قلم فرسائی کر رہا تھا یہ تھا کہ ہندوستان کی نجات کے لیے، ہندوستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض انجام دینے کے لیے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے جس کا اعلان ۱۹۱۲ء میں "الہلال" کے پہلے ہی نمبر میں کر چکا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ ایسے لوگ موجود ہوں گے جنھوں نے الہلال کو فراموش نہ کیا ہوگا۔"

الہلال کے پہلے نمبر میں جس بڑے نمایاں مقصد کا اعلان کیا گیا تھا، کیا تھا؟ میں فخر کے ساتھ اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ہندو مسلمانوں کا اتفاق تھا۔ میں نے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ احکامِ الٰہی کی رو سے مسلمانوں کے لیے اگر کوئی فرض ہو سکتا ہے تو نہ صرف ایشیا کو بلکہ اس تمام کرۂ ارضی کی سچائی کو آج چیلنج دے رہا ہے، اس کو شکست دینا ہے، جس کے غرور سے انسان کی عالمگیر صداقت کو سب سے بڑا خطرہ ہے وہ برٹش گورنمنٹ کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں ہے۔"

مولانا آزاد نے ۱۹۲۳ء میں پہلی بار آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارتی ذمہ داریاں قبول کیں۔ اس کے اجلاس دہلی میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:

"غالباً آپ میں سے وہ تمام حضرات جو گزشتہ بارہ سال کے اندر مسلمانوں کے جماعتی تغیرات کا مطالعہ کر رہے ہیں، اس سے واقف ہوں گے کہ ۱۹۱۲ء میں سب سے پہلی صدا میری صدا تھی جو اس طرزِ عمل کے خلاف بلند ہوئی۔ میں نے اپنے ہم مذہبوں کو اس طرف بلایا کہ وہ علیحدگی کی پالیسی پر قائم رہ کر اپنی ہستی کو ملک کی آزادی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں پر اعتماد کریں، کانگریس میں شریک ہوں، ملک کی آزادی کو اپنا نصب العین بنائیں اور فرقہ وارانہ تنظیم سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس وقت میری یہ پکار میرے تمام ہم مذہبوں پر شاق گزری، پوری قوت کے ساتھ میری مخالفت کی گئی لیکن بالآخر وہ وقت بہت جلد آگیا جب مسلمانوں نے اس حقیقت کی سچائی کا اعتراف کیا جب ۱۹۱۹ء میں رانچی میں نظر بند تھا تو سن رہا تھا کہ جوق در جوق مسلمان کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں۔"

مولانا آزاد دوسری بار جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے تو ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ میں اس کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت کے بعض اقتباسات یہ ہیں:

مجھے نہیں معلوم آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے ۲۸ برس پہلے (یعنی ۱۹۱۲ء الہلال کا سالِ اجرا) میں الہلال کے صفحوں میں لکھتا رہا ہوں۔

اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کرلیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور آج بھی اسی طرح کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اور اس لیے ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کا دروازہ کھول دیا، غلط دیواریں چُنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی، دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت میں نہیں دیکھ سکتی ...... میں نے ۱۹۱۲ء میں الہلال جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۸ء تک کا وہ زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جب چار برس کی نظربندی کے بعد رہا ہوا تو میں نے دیکھا کہ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچا توڑ چکی ہے اور نیا سانچا ڈھل رہا ہے ...... میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں خطاب کیا تھا، آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں ...... میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی ایک راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا مگر آج انھیں مجھ سے اختلاف ہے۔ میں اس اختلاف کے لیے انھیں ملامت نہیں کروں گا ...... میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں ...... لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی ...... میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں، میں ہندوستان کی ایک ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔"

یہ اقتباسات تو اس دور کے ہیں جب ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد جاری تھی مگر مولانا نے اس جدوجہد کے لیے جو موقف اختیار کیا تھا، اس کا ذکر وہ حصولِ آزادی کے بعد کرتے رہے اور بار بار الہلال کی بنائے کہنہ کی یاد تازہ کرتے رہے، وہ الہلال کا ذکر اس اسلوب سے کرتے تھے جیسے آج بھی اس کی ضرورت باقی ہے۔

آزادی کے بعد ملک جس قیامتِ صغریٰ سے دوچار ہوا، اس کی تفصیلات سے کون واقف نہیں ہے۔ فسادات کے شعلوں نے لوگوں کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا تھا۔ اس معرکۂ رستخیز میں مولانا آزاد کی ایک تقریر جنبۂ مرہم ثابت ہوئی۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں دلی کی جامع مسجد میں مسلمانوں کو خطاب کیا تھا۔ یہ تقریر اتنی مقبول ہوئی کہ مدتوں ملک کے اخبارات میں شائع ہوتی رہی اور آج بھی جب مولانا کی تقریروں کا کوئی مجموعہ شائع ہوتا ہے تو اس تقریر کا یا تو پورا متن یا اس کے بعض اقتباسات اس میں ضرور شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ تقریر ایسے حالات میں کی گئی تھی جو الہلال کے زمانۂ اجرا سے یکسر مختلف تھے مگر مولانا نے یہاں بھی الہلال کا دامن نہیں چھوڑا اور کہا:

"ایک وقت تھا، میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے کہا تھا ـــــ جو ہونے والا ہے، اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی ہے۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلو تہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمھارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے مٹ جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

یہ طویل عبارت مولانا آزاد کے اس مضمون پر مبنی ہے جو "الجہاد، الجہاد" کے عنوان سے ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے مولانا کی تقریر کا سیاق و سباق اور واضح ہو جائے گا:

"فرض کیجیے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائے گا؟

اس میں لکھا جائے گا کہ یہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا ایک کھلونا، دستِ اجانب میں بازیچۂ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک خنجر بن کر رہی۔۔

غفلت و سرشاری کی بہت سی راتیں بسر ہو چکیں، اب خدا کے لیے بسترِ مدہوشی سے سر اٹھا کر دیکھیے کہ آفتاب کہاں تک نکل آیا ہے، آپ کے ہم سفر کہاں پہنچ گئے ہیں اور آپ کہاں پڑے ہیں؟

یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخلِ حب الوطنی ہے مگر آپ کے لیے ایک فرضِ دینی اور داخلِ جہاد فی سبیل اللہ۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق و صداقت اور انسانی بند استبداد و غلامی کے توڑنے کے لیے کی جائے۔ آج جو لوگ ملک کی فلاح اور آزادی کے لیے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں، یقین کیجیے کہ وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف ہیں جس کے لیے دراصل سب سے پہلے آپ کو اٹھنا تھا۔"

۱۹۴۹ء میں مولانا آزاد نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے جلسۂ تقسیمِ اسناد کو خطاب کرتے ہوئے الہلال کا ذکر بڑے معنی خیز انداز میں کیا۔ انھوں نے اس خطبے میں سرسید کی خدمات کا اعتراف فراخ دلی کے ساتھ کیا اور کہا کہ انھوں نے تحقیق و تشریح اور مسلمانوں کے افکار کی تشکیلِ جدید کے نئے دبستانوں کو فروغ دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ شاید ہندوستان کے کسی رسالے نے اپنی نسل کے ذہنوں کو اتنا متاثر کیا ہو جتنا 'تہذیب الاخلاق' نے کیا۔ اس کے باوصف مولانا آزاد نے اپنے بنیادی نقطۂ نظر کو چھپایا نہیں۔ انھوں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا:

"آپ کے وائس چانسلر صاحب نے جب از راہِ مہربانی مجھے علی گڑھ آنے اور سالانہ جلسۂ تقسیمِ اسناد سے خطاب کرنے کی دعوت تار دیا تو اسے قبول کرتے وقت فطری طور پر میرا ذہن اس واقعہ کی طرف منتقل ہوا جب پہلے پہل میرا سابقہ علی گڑھ سے پڑا تھا۔ یہ آج سے ۳۶ سال قبل (الہلال کی اشاعتِ اوّل کا زمانہ) کا واقعہ ہے۔ یہ ایسے حالات میں وقوع پذیر ہوا تھا جن کے تحت بہت سے حضرات نے مجھے اس ادارے کا مخالف بنا کر پیش کیا۔ حالانکہ حقائق اس کے بالکل برعکس تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستانی مسلمان نہ صرف تمام عصری سیاسی تحریکوں سے الگ تھلگ تھے

بلکہ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کے بھی مخالف تھے۔ مسلمانوں کے اس سیاسی جمود کا واحد سبب وہ رہنمائی تھی جو انیسویں صدی کے ربع آخر میں اس ادارے کے بانی سرسید نے دی تھی۔ علی گڑھ پارٹی نے اس حکمت عملی کو اپنایا اور ہندوستانی مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس سے الگ رکھنے کی کوشش کی اور کچھ برگزیدہ شخصیات کو چھوڑ کر عام طور پر انھیں کامیابی نصیب ہوئی۔

اسی پس منظر میں ۱۹۱۲ء میں میں نے الہلال نکالا۔ اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا ہی سے میں اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے اور اس کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے کام کرنا چاہیے۔ لہٰذا یہ ناگزیر تھا کہ میں اس حکمت عملی پر نکتہ چینی کروں جسے سرسید احمد خاں نے اپنایا تھا جو علی گڑھ پارٹی کی عام پالیسی کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس لیے سیاسی مسئلہ پر میرا اور اس پارٹی کا اختلاف ہوا۔ اس پارٹی کے ارکان نے مجھے نہ صرف اس ادارے کے بانی کا مخالف سمجھ بیٹھے بلکہ خود اس ادارے کا بھی مخالف تصور کیا اور کچھ حضرات تو اس حد تک بڑھ گئے کہ مجھے اس کا دشمن تصور کرنے لگے۔ حالانکہ کوئی بات بھی اس سے زیادہ حقیقت سے بعید نہیں ہو سکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں سرسید کو انیسویں صدی کی عظیم ہستیوں میں شمار کرتا تھا اور آج بھی کرتا ہوں لیکن تعلیمی اور سماجی اصلاح کے میدان میں ان کی کامیابیاں، سیاسی میدان میں ان کی غلط حکمت عملی پر تنقید سے مجھے نہیں روک سکتیں۔ ۳۰ سال (الہلال کا زمانہ ۱۹۱۲ء) بیت گئے اور جب میں اس دوران پیش آنے والے واقعات کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

سطور بالا میں مولانا آزاد کے رشحات قلم کے متعدد ایسے اقتباسات نقل کیے گئے جو الہلال میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ ان اقتباسات سے یہ ثبوت فراہم ہو جاتا ہے کہ امتداد زمانہ کے باوصف مولانا کی راہ عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ جمعیۃ علماء ہند، خلافت کانفرنس اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے مگر انھیں راہ عمل یا منزل مقصود کے تعین کی دوبارہ ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ اُن مسافروں میں ہیں جو آغاز سفر سے پہلے اپنے راستے اور اپنی منزل کی جزئیات کا پہلے سے احاطہ کر لیتے ہیں۔ وہ خود کہتے ہیں:

میری راہوں میں کبھی تبدیلی ہوئی۔ میرے سفر میں کبھی پس و پیش کا تذبذب پیش آیا ہے۔ تبدیلیاں فکروں میں ہو سکتی ہیں، قیاسوں میں ہو سکتی ہیں، پولٹیکل حکمت عملیوں میں ہو سکتی ہیں۔ انسانی تقلید اس کا سرچشمہ ہے اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اس کا منبع لیکن ان عقائد میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی جو وحی اور تمرسل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہوں۔ الحمد للہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا ہوں، وہ میرے عقائد و معلومات تھے، تمھارے تڑوں کی طرح آراء و معلومات۔ تھے (مسئلہ خلافت و جزیرۂ عرب ص ۱۵۴)

ہندوستان کی سیاسی اور فکری تاریخ میں مولانا جیسی غیر متذبذب اور غیر متزلزل شخصیت مشکل سے ملے گی۔ ۲۳، ۲۴ سال کی عمر میں انھوں نے ایک کلیہ مرتب کیا تھا جس میں کبھی کسی لچک کی ضرورت پیش نہیں آئی کبھی کبھی کچھ لوگوں کو مولانا کی شخصیت میں تضاد اور تناقض نظر آتا ہے۔ جب وہ جزیرۂ عرب اور اماکن مقدسہ پر اظہار خیال کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی ایک علیحدہ قومیت پر اصرار کر رہے ہیں اور جب وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے نصب العین اور اس کے لائحہ عمل پر بحث کرتے ہیں تو ان سے بڑا نیشنلسٹ کوئی نظر نہیں آتا۔ در اصل یہ تضاد و تناقض فریب نظر کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ مولانا آزاد ہندوستان کو دنیا کے دوسرے ممالک کے تناظر میں دیکھ رہے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ہندوستان اس لیے غلام نہیں کہ وہ ہندوستان ہے بلکہ وہ غلام بنانے والوں کی بساط سیاست اور ان کی شاطرانہ چالوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ یورپی سامراج کے انداز فکر کو پہچانتے تھے اور اس کی آمرانہ توسیع پسندی اور جاہ طلبی کے نہ رکنے والے سلسلۂ لامتناہی کے نبض شناس تھے۔ ہندوستان کی غلامی یورپ کے شجر استبداد کی ایک شاخ تھی، مولانا شاخ کو نشانہ بنانے کے بجائے، اس کی جڑوں پر تیشہ چلا رہے تھے۔ وہ یورپی سامراج کے خلاف ایک ایسی تحریک چلانا چاہتے تھے جس میں ساری دنیا کے ستم کشان محکومیت شامل ہوں۔ وہ چاہتے تھے کہ جس خطے میں بھی سامراج کے قدم جمے ہیں، وہاں کے عوام حقوق طلبی کے لیے آمادۂ پیکار ہو جائیں۔

یہ کون نہیں جانتا کہ وہ خطے دیو استبداد کے ننگے ناچ کا اسٹیج بن چکے تھے۔ جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی اور پھر اس نکتے کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اسی دیو استبداد کو مظلوم ممالک آزادی کی نیلم پری سمجھتے تھے۔ مولانا اصرار کرتے تھے کہ ظالم کو ظالم کے علاوہ اور کچھ نہ سمجھا جائے۔ ساری دنیا کے مسلمان یورپ کی سازشوں کے پے در پے شکار ہو رہے تھے، ہندوستان کے مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ یورپی سامراج بھیس بدل بدل کر مسلمانوں کے سامنے "مراعات" کے ٹکڑے پھینکتا تھا اور مسلمان قطرے سے گہر ہونے کے فریب میں حلقۂ صد کام نہنگ میں پھنس کے رہ جاتے تھے۔ مراعات کے جال نے دو قومی نظریے کو فروغ دیا اور یورپ مطمئن تھا کہ وہ اپنی قیامت کی چال میں کامیاب ہو گیا۔ مولانا مسلمانوں کے سامنے سامراج کے خط و خال کو آئینہ کرنا چاہتے تھے۔ صورت حال یہ تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کا سواد اعظم دنیا و مافیہا سے بے خبر تھا، ان کی جو چھوٹی بڑی جماعتیں تھیں وہ اپنے خول سے باہر نکلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھیں۔ وہ اپنے حال میں مست تھیں اور علیحدگی پسندی اور انگریز دوستی کو اپنے وجود بقا کی معراج سمجھتی تھیں۔ وہ قدم قدم پر دین و مذہب کا سہارا لیتی تھیں لیکن اس حد تک جو ان کے ذاتی مفاد کا ضامن ہو۔ مولانا کے اصل مخاطب مسلمان تھے، وہ انھیں انگریز دوستی کے عواقب سے آگاہ کرنا چاہتے تھے۔ مولانا صرف دینیات کے عالم نہیں تھے بلکہ رنگا رنگ تاریخ پر بھی وہ دانشورانہ مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے اسلامی تعلیمات سے استفادہ کیا اور اپنے لیے جو راہ عمل منتخب کی، اس کا مرجع یہی تعلیمات تھیں۔ انھیں یقین کامل تھا کہ اگر مسلمان صدق دلی کے ساتھ ان تعلیمات کو اپنا لیں تو ان کے اندر حریت پسندی، حب الوطنی اور عالمی پیمانے پر انسان دوستی کا جذبہ خود بخود پیدا ہو جائے گا۔ انھیں اس کا بھی یقین تھا کہ ان تعلیمات کے سہارے وہ نہ صرف سامراج کے سحر ساحرانہ سے نجات پا جائیں گے بلکہ وہ جن فروعی مسائل میں الجھ کر رہ گئے ہیں، ان سے بھی انھیں چھٹکارا مل جائے گا۔ مولانا کو اس کا بھی یقین تھا کہ آزادی کے راستے کا کوہ گراں ہندو مسلم مناقشہ ہے جو سامراج کی دین ہے۔ اسلامی تعلیمات اس کوہ گراں کو بھی خاک کر دیں گی۔

مولانا نے اسلامی تعلیمات پر مبنی جس راہ عمل کو اختیار کیا تھا، اسی کا نام "دعوت الہلال" رکھا تھا اور عمر بھر وہ اسی دعوت کا اعادہ کرتے رہے۔ ان کی دعوت کو گنجینۂ معنی کا طلسم سمجھنا چاہیے، اس میں اتنی وسعت تھی کہ انسانی فلاح کی جزئیات کا بھی وہ احاطہ کر لیتی ہیں۔ دو قومی نظریے کا بطلان، ہندو مسلم اتحاد اور ملکی سالمیت ان کی دعوت کے مظاہر تھے۔ حصول آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد، آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں شمولیت اور فکر و نظر کی آزادی مولانا کی دعوت کی اہم قدریں تھیں۔

جن لوگوں کا مطالعہ غیر مربوط اور مولانا آزاد کی بعض متفرق تحریروں تک محدود ہے، انھیں الہلال کے بعض عنوانات چونکا دیتے ہیں۔ حزب اللہ، من انصاری الی اللہ، الجہاد، الخ

اخلاص المستقیم، اسرار اسلام، شئونِ اسلامیہ، شئونِ عثمانیہ، کارزارِ طرابلس ـــــــ یہ اور اس طرح کے بعض عنوانات اسی وقت تک غلط فہمی پیدا کر سکتے ہیں جب تک ان کے مباحث کا مطالعہ نہ کیا جائے۔ مولانا نے وقت کے بعض بڑے نازک مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے لیکن یہ ان کی طبیعت کا کھرا پن ہے کہ انھوں نے ان مسائل کے ذیل میں بھی کھل کر وہ قومی نقطۂ نظر کا اعلان کیا ہے۔ مولانا سیکولرزم کی سچی تصویر تھے، وہ عالمِ باعمل تھے اور دنیائے سیاست کے بطلِ جلیل، ان کے کردار کا یہ رنگ تاریخِ ہند میں ہمیشہ چوکھا نظر آئے گا کہ انھوں نے ہزاروں صفحات لکھے اور شائع کیے مگر کہیں بین السطور بھی ایک لفظ ایسا نہیں آیا جس میں فرقہ پرستی کا ہلکا سا بھی شائبہ ہو۔ اسلام کی عالمگیر صداقت پر وہ اعتقاد رکھتے تھے اور اس اعتقاد نے انھیں اتحاد و یکجہتی کا نمونہ بنا کر پیش کیا تھا!

الہلال کی اشاعت کا پہلا اور آخری مقصد یہی تھا کہ "دعوت" کو عام کیا جائے۔ انھوں نے الہلال کی متعدد اشاعتوں میں اس دعوت کی توضیح و تصریح کی ہے۔ انھوں نے بارہا مراسلہ نگاروں کے جواب میں یہی لکھا کہ الہلال کا مقصد "دعوت" کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ بنگال خلافت کے خطبۂ صدارت (۱۹۲۰ء) میں انھوں نے اعلان کیا:

"۱۹۱۲ء میں جب میری موجودہ پبلک زندگی کا بالکل ابتدائی عہد تھا، مجھے موقع ملا کہ اپنی آئندہ زندگی کے لیے ایک "مدبیل" قرار دے لوں۔ حدیث کی دولت کے دستِ تاییدِ الٰہی کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اصولِ عمل کی مختلف راہیں میرے سامنے تھیں، اور میں چاہتا تھا کہ میرا سر اس دانشمند مسافر کی طرح ہو جس نے سفر سے پہلے راہ و منزل کے سارے مرحلوں پر غور کر لیا ہے . . . میں نے اپنے لیے جو راہِ عمل منتخب کی تھی وہ دعوت و تبلیغ کی راہ تھی، موجودہ زمانے کی مصطلح لیڈرشپ کی راہ نہ تھی۔"

۱۹۲۱ء کے نومبر میں جمعیۃ علماء ہند کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ اس میں مولانا آزاد نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس کا یہ اقتباس قابلِ لحاظ ہے:

". . . ۱۹۱۲ء میں میں نے الہلال جاری کیا تھا . . . . . حضرات! مجھے امید ہے کہ آپ مجھے خودستائی اور خود فراموشی کا الزام نہ دیں گے، اگر میں بطور تحدیثِ نعمت اس موقع پر دعوتِ الہلال کا بھی ذکر کروں۔ آج آپ کی یہ مقدس و مبارک جمعیۃ العلماء جس مقصد کی ترجیح میں منعقد ہوئی ہے، میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی یوسفِ مقصود ہے جس کے فراق میں ۱۹۱۲ء سے "مقبل" وار اسماعیل یوسف اسی کی فغاں سنجی کر رہا ہوں اور جس کے لیے میں نے الہلال مرحوم کے ورقوں کو کبھی اپنے چشمِ خونیں کے آنسوؤں سے رنگا ہے، اور کبھی اس کے سواد و حروف کے اوپر اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیے ہیں۔ ۱۹۱۲ء سے لے کر آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلب اور میری روح کی عشق و شیفتگی کا محبوب رہا ہے۔ خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جو اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری جب میں نے اس کی تمنا میں اپنے بسترِ غم و اندوہ پر بے قراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں۔ میں نے اپنی آزادی کی تمام فرصت اسی کے عشق میں بسر کی اور نظر بندی و قید کے چار سال بھی اسی کے فراق میں کاٹے . . . . . پس اے عزیزانِ ملت! اگر آج علمائے امت کی یہ جمعیت مبارکہ جمعیۃ علماء کی شکل میں طالع و نظر افروز ہوئی ہے تو مجھے کہنے دیجیے کہ یہ میرے دس سالہ سوالوں کا جواب ہے، میری تمناؤں اور آرزوؤں کا ظہور ہے، میری فریاد اور التجاؤں کی قبولیت ہے . . ."

الہلال کی ۱۹ فروری ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں وہ رقم طراز ہیں:

"آغازِ اشاعتِ الہلال سے "دعوت" کا لفظ میری زبان پر ہے اور اس کثرت سے بار بار اس لفظ کو دہراتا ہوں کہ شاید بعض لوگ سنتے سنتے اکتا گئے ہوں گے۔ میں نے کبھی کسی اخبار کا ذکر نہیں کیا جو اپنے سروسامان کے ساتھ نکالا گیا ہو، اور نہ میں نے کبھی حیثیت تالیف اور انتشارِ مقالات و رسائل کا ذکر کیا جس کے لیے غیر معمولی محنت و مشقت برداشت کی جاتی ہو، بلکہ میں نے ہمیشہ ایک "دعوت" کا اعلان کیا ہو ایک مقصود و حاصل کو اپنے سامنے رکھتی ہے، اور ساتھ ہی چند مقاصد پیش کیے جو ہمیشہ سے انسانوں کی جماعتوں اور آبادیوں کے سامنے پیش ہوتے آئے ہیں۔ ان مقاصد میں ندرت و جدت نہ تھی مگر صداقت ضرور تھی۔ اور جس بیان میں صداقت ہو، ضرور ہے کہ وہ نئی نہ ہو کیونکہ دنیا کی سب سے زیادہ پرانی چیز صداقت ہی ہے۔"

مولانا نے دعوتِ الہلال کی توضیح و تصریح بارہا کی، اسی دعوت کو یوسفِ مقصود کہا اور اسی دعوت کو "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی تحریک سمجھا، اسی دعوت میں وہ سچائی بے نقاب ہوئی ہے جس کا دامن مولانا آزاد نے کبھی نہیں چھوڑا۔ خود مولانا کے الفاظ ہیں:

" دعوتِ الہلال اپنی پہلی منزل سے گزر چکی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ الہلال متعدد حیثیتیں رکھتا ہے۔ اس میں ایک حیثیت دعوت و تحریک کی ہے۔ تحریک کے لیے پہلی منزل یہ ہے کہ دلوں کی غفلت دور کی جائے۔ عام احساس و بیداری پیدا ہو جائے اور جن مقاصد کے لیے پکارا جا رہا ہے وہ ہزاروں دلوں میں اپنا گھر بنا لیں جب ایسا ہو جائے تو دعوت اپنی پہلی منزل سے گزر گئی۔ اس کے بعد اس سے سخت تر اور اہم تر منزلوں کی طرف بڑھنا ہے۔ استعداد و دعوتوں کی تخم ریزی کے بعد اس کے بعد آب پاشی کی فکر کیجیے تاکہ کھیت پوری طرح نشو و نما پائے اور فصل آئے تو کاٹنے کے لیے ہر شاخ اپنا ذخیرہ پیش کر سکے

اس آب پاشی کی مختلف صورتیں ہیں اور اسی کو میں "دوسری منزل" قرار دیتا ہوں۔

الحمد للہ کہ ضلالت و فساد کے بہت سے چھوٹے چھوٹے بت دو نیم ہو کر گر چکے ہیں۔ "طاغوتِ اعظم" کی پرستش اور مرعوبیت کی جگہ بڑا با خوب ہو گیا اور دلوں میں خدائے ابراہیم و محمد (علیہما الصلوٰۃ والسلام) کی عظمت حقیقی جاگزیں ہو چکی ہے۔ اور احساس و افکار کے انقلابِ عام کا ایک ایسا عدیم النظیر اور محیر العقول منظر سامنے ہے جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا!

اب دوسری منزل اس کے بعد کی ہے۔ اور اس طرح کہ اس استعداد کو فوراً ایک ایسی منظم و ناقد صورت میں منتقل کر دیا جائے کہ اعمال و احوال میں اس کا ظہور پوری قوت و تاثر کے ساتھ نمایاں ہو جائے اور ایسی جو تبدیلی مختلف گوشوں اور دماغوں میں پھیلی ہوئی اور متفرق ہے اسے یک جا اور مجتمع کر کے ایسی جماعتیں پیدا کی جائیں جو قولاً و عملاً دعوتِ اسلامیہ کی حامل ہوں۔" (الہلال جلد ۵، شمارہ ۲)

جس اخبار کا مقصدِ اشاعت ایک مخصوص دعوت ہو ـــــــ ایسی دعوت جو ملت کو مفاد پرستی کے مانوس اور شناسا راستوں کو ترک کر دینے کی تلقین کرے اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی ترغیب دے، اس کا ردِ عمل مثبت بھی ہو سکتا ہے اور منفی بھی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے مولانا کی کوئی ذاتی اور شخصی غرض وابستہ نہیں تھی، مولانا کا یہ اقدام فی سبیل اللہ تھا، حالات نے ان کی رگ و پے میں ایک جذبۂ آتش فشاں دوڑا دیا تھا جو الہلال کی صورت میں ایک دن پھوٹا اور اس طرح پھوٹا کہ صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک بھی اس کے شعلوں کی لپیٹ

میں آگے کا اس کی اجمالی داستان مولانا کی زبان سے سنیے۔ الہلال کے آغاز اور آغاز سے پہلے کی روداد مولانا ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

" چہ گونہ سے بہ یساں آدم دریں مجلس — کہ بادہ وصلہ سورت و مسند بدستند

" ۱۹۱۱ء کے موسم سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں میری چشم بیداری نے ایک خواب دیکھا۔ انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک ذہن و تخیل میں ہیں، عالم بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہیے کامل چھ برس اس کی تعبیر کی جستجو آمیز جستجو میں صرف ہوگئے۔ امیدوں کی طلب، اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا، اور یاس و قنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ و عزم پر غالب آگیا لیکن الحمدللہ کہ ارادے کا استحکام اور توفیق الٰہی کا اعتماد ہر حال میں طمانیت بخش تھا، یہاں تک کہ آج اس خواب عزیز کی تعبیر عالم وجود میں پیش نظر ہے۔" (الہلال جلد ۱، شمارہ ۱)

" ہمارے وہ احباب جن کو اس ارادے کا (الہلال کے اجرا کا) علم تھا مگر ہمارے حالات کا علم نہ تھا، ان گذشتہ سالوں کے اندر طرح طرح کے خیالات و ظنون سے طعنہ زن رہے بعضوں نے اس مسلسل تاخیر کو طبیعت کی بے استقلالی و تلون کا نتیجہ سمجھا، جنہوں نے قوت ارادی کے ضعف سے اسے منسوب کیا اور بعض نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ فکر و تصور سے زیادہ اس ارادے کی قسمت میں اور کچھ نہیں ہے۔"

" ہم نے جب الہلال کی اشاعت کا ارادہ کیا تو سب سے پہلے یہ سوال سامنے آیا کہ مقاصد و خیالات کی جو متاع لے کر بازار میں نکلے ہیں، اس کے خریدار بھی کتنے ہوں گے، نفرت و استکراہ کے سوا ان خیالات کی قسمت میں اور کیا ہے؟ اس لیے ضرور ہے کہ رسالے میں کچھ باتیں ایسی بھی ہوں جو دلچسپ ہوں، کی بھی نشتر کی ایک نہ چادیں اور اس طرح کم از کم صرف ہی ہماری صدائیں کانوں تک پہنچ جائیں۔" (الہلال جلد ۱، شمارہ ۳)

الہلال نکلا اور مولانا کی صدائیں کانوں تک پہنچیں مگر جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، اس کے ردعمل کی مثبت اور منفی دونوں صورتیں سامنے آئیں۔ منفی ردعمل کا یہ حال تھا کہ فیض احمد فیض کا یہ شعر شاید کسی حد تک اس کی ترجمانی کرسکے :

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک دشنام — چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت

دوسرے معاصر اخبارات اور مضامین کو چھوڑیے، خود الہلال کے صفحات گواہ ہیں کہ مولانا کو کس کس طرح نخچیر قزاک بنایا گیا۔ الہلال میں بعض ایسے مراسلات شائع ہوئے جو ہر طرح شرافت نفس، شرافت علم اور شرافت تحریر کی نفی کرتے ہیں مگر مولانا اس کی فکر کیا کرتے، وہ ہمیشہ فیض ہی کے اس مصرعے کا آئینہ تھے کہ

ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

مولانا کو جس طرح اپنی دعوت پر اصرار تھا، اسی طرح ان کو اس دعوت کے منفی اثرات کا بھی ادراک تھا الہلال کا یہ اقتباس دیکھیے :

" ہم خاک نشینان کوی یار ملت، سرد شیان عزدمامہ کے دل و عطا کے مستحق نہیں، خاک کے ڈھیر پر سے گذریے گا تو دامن و آستین ضرور غبار آلود ہوں گے ہم سے مل کر اپنے قیمتی اور سپید کپڑوں کو کیوں خاک آلودہ کرتے ہیں کسی عطر فروش کو ڈھونڈیے کہ آپ کے شرف کا لطف سے سرشار ہوگا، تو ایسے نسیم عطر بیز سے آپ کے مشام جاں کو سرور بھی کرے گا۔

ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان میں آئے ہیں صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں عیش کے پھول نہیں بلکہ طلب و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈھتے ہیں دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آئے ہیں ایسوں کی اعانت کرکے آپ کا جی کیا خوش ہوگا؟ اور پھر ایسے غلط دوستوں کو آپ کی اعانت فرمائیاں کیا نفع پہنچا سکیں گی۔

بہ وفاست طوفی کہ مرغ ہمت ما — کہ ما دو رحمت نشید کہ نے عز باستہ" (الہلال جلد ۱، شمارہ ۲)

مولانا آزاد کا ایمان تھا کہ سچائی ہمیشہ بار آور ہوتی ہے، دعوت الہلال ایک سچائی تھی اس لیے وہ بار آور ہوئی۔ الہلال ایک ایسی منزل ہے جس نے ہماری سیاسی تاریخ کو حریت پسندی، انسان دوستی، اجتماعیت اور جمہوریت کے بے لچک کردار سے آشنا کیا۔ اس نے محکوموں کو زندگی کرنے کا سلیقہ سکھایا اور ظالموں کو ان کے انجام سے متنبہ کیا الہلال کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ مسلمانوں کو خود ساختہ اور خوشامد پرست قائدین کے چنگل سے آزاد کرا دیا۔ اب مسلمانوں کے سامنے دو راستے تھے، ایک راستہ تو وہ تھا جو الہلال کی اشاعت سے پہلے معقول خواص تھا اور جو انگریز دوستی کو استحکام بخشتا تھا اور دوسرا راستہ دعوت الہلال کا زائیدہ تھا جو مسلمانوں کو اپنے ذہن سے سوچنے اور اپنے دست و بازو سے کام لینے کا سلیقہ سکھاتا تھا۔ مسلم قیادت آمریت کا شکار تھی، الہلال نے اس طلسم کو توڑ دیا۔ آمریت نے مذہب کا لبادہ اوڑھ لیا تھا، الہلال نے مذہب کی بنیادی تعلیمات ذہن نشین کرا دی تاکہ اس لبادے کی ماہیت کا علم ہو جائے آمریت یورپی سامراج کے اشاروں پر رقص کرتی تھی، وہ ترکی کا مسئلہ ہو یا طرابلس کا، جنوبی افریقہ کا ہو یا خود ہندوستان کا، آمریت اسی حل کو قبول کرتی تھی جسے سامراج پیش کرتا تھا۔ الہلال نے اسلامی ممالک پر انگریزوں کے مظالم کو اس شدت کے ساتھ نمایاں کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے محسوس کر لیا کہ ہماری بدحالی اور غلامی کی جڑیں ان سفید پوستوں کے قلوب سیاہ میں پیوست ہیں۔

جس تیزی سے کے ساتھ قوم پر الہلال کے مثبت اثرات مرتب ہوئے وہ حقیقی معنی میں حیرت انگیز ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک پھوڑا تھا جسے نشتر کی ضرورت تھی، الہلال نے نشتر زنی کی اور قوم کے حالات میں انقلاب آگیا جو مسلم لیگ آمریت کی علامت تھی اس کا بھی لہجہ بدل گیا۔ جب سر ابراہیم رحمت اللہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے اور انھوں نے لیگ کے سابقہ خطبات صدارت کی روش سے ہٹ کر اپنا صدارتی خطبہ پیش کیا تو مولانا آزاد نے ۴ فروری ۱۹۱۳ء کے الہلال میں لکھا۔

" آنریبل موصوف (مسٹر ابراہیم رحمت اللہ) جب لیگ کی صدارت کے لیے منتخب ہوئے تو لوگ مسلمانوں کے موجودہ حالات کی رفتار کو دیکھ رہے تھے۔ وہ تمام ہندوستان کے کسی مشہور آدمی کی جگہ ایک دور دراز اور تقریباً اسلامی مسائل کے مرکز سے الگ تھلگ صوبے کا نام دیکھ کر ناامید و بیم میں پڑ گئے۔ مگر میں نے اسی وقت اپنے بعض دوستوں سے کہا کہ سر ابراہیم رحمت اللہ انڈین نیشنل کانگریس میں شریک رہ چکے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ جو صاحب نظر گوکھلے کی اس ایک ہی درسگاہ سیاست میں رہ چکا ہے اس سے کسی آزادانہ گو بے واہی و حکمت سیاسی خدمت کی توقع کبھی

ناکام نہیں ہوسکتی۔

میں کہتا ہوں کہ جب سے مسلمانوں نے پولیٹیکل مقاصد کے نام سے کام شروع کیا ہے، ان کے پولیٹیکل لٹریچر میں یہ پہلی تقریر ہے جو اس جامعیت اور عمدہ قوام بحث کے ساتھ مرتب ہوئی ہے۔

حتیٰ کہ کانگریس کے بعض ارکان نے میرے سامنے اس کا اعتراف کیا کہ خود کانگریس کے لٹریچر میں بھی یہ تقریر کامل امتیاز پانے کی مستحق ہے۔

ہمیشہ ہماری بڑی بڑی کانفرنسوں کی افتتاحی تقریریں نہایت کم وقعت والی اترتی ہیں، اور بحث و قابلیت اور اصابت رائے و حسن بیان کا اس میں کوئی مفید و ممتاز حصہ نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے انڈین نیشنل کانگریس نے اپنی افتتاحی تقریروں کا ایک ایسا وسیع لٹریچر جمع کر دیا ہے جو ادب و انشا پردازی، قوت تحریر و بیان، خوبی بحث و استدلال، کثرت مواد و معلومات، حتیٰ کہ ذوق و صدق، تعلیم و درس سیاست، غرض کہ ہر حیثیت سے ہندوستان کے موجودہ علم و ادب کا ایک ممتاز ترین حصہ ہے۔ بلکہ آنریبل سر ابراہیم رحمت اللہ کے ایڈریس کے بعد کم از کم ایک تحریر تو لیگ کے پاس بھی ایسی موجود ہوگئی ہے جسے افتخار کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔"

سیاسی معاملات میں لب و لہجہ کی یہ تبدیلی الہلال کا کارنامہ ہے۔ مولانا نے خود محسوس کرلیا تھا کہ جس مقصد کے لیے الہلال کا اجرا عمل میں آیا تھا، وہ "پہلی منزل" کی حد تک پورا ہوگیا۔ وہ الہلال میں بار بار "دعوت الہلال" کی کامیابی کا ذکر کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ان معروضات کی توثیق ہو جاتی ہے۔

"پس الہلال، اور الہلال کی دعوت ایک بیج تھا جو اب سے ڈیڑھ برس پہلے بویا گیا تھا باوجود ان تمام انتہائی بے سر و سامانیوں کے جو دنیا کے سامنے ہیں، باوجود ان تمام موانع اور عوائق کے جن سے لوگ بے خبر ہیں اور جن میں سے ہر ہر واقعہ کو اگر ایک ایک سطر میں بھی لکھوں، جب بھی کئی سو سطروں کی ایک کتاب بن جائے۔ اور پھر باوجود ایک قوی ترین گروہ مخالفین، منکرین و معاندین مفسدین کی موجودگی کے اور ہر دم سرگرم مخالفت و فساد رہنے کے الحمدللہ کہ میں زندہ و سلامت مشغول کار ہوں۔ میرے کاروبار دعوت کی کوئی سعی ضائع نہ گئی۔ میرے جد و عمل کا کوئی قدم میرے کاروبار دعوت کی کوئی سعی ضائع نہ گئی، میرے جد و عمل کا کوئی قدم رائیگاں نہ گیا۔ میری دعوت اپنا کام کرچکی ہے۔ میں نے جو مانگا تھا وہ مجھے حاصل ہوگیا ہے۔ مجھے مہلت بھی دی گئی اور اسباب بھی مرحمت ہوئے۔ میں نے اپنے بعض مقاصد کے نتائج کو اپنے سامنے دیکھنا چاہا اور وہ پہلی ششماہی کے گزرنے کے بعد ہی دکھلا دیے گئے۔

میں دنیوں سے آلودہ ہوں مگر میری بےکار رہنے کی نہ تھی۔ نہیں میری دعوت کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو ہر سچے کے کام کے ساتھ ہونا چاہیے۔" (الہلال جلد ۳ شمارہ ۳)

"میں یہاں اس مقام کا تذکرہ نہیں کرتا جس کی مجھے حسرت ہے، بلکہ اس کا حال بیان کر رہا ہوں جس میں اپنے تئیں پاتا ہوں اور نہیں پسند کرتا ہوں کہ اس کا تذکرہ نہ کروں

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

میں بیج بلا تنائہ انکسار کے اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں میرے مناظر و مشاہدات نہایت عجیب و غریب و عبرت انگیز ہیں۔ میں جب کبھی ان نتائج عظیمہ کو دیکھتا ہوں جو فضل الٰہی نے الہلال کی دعوت کو عطا فرمائے اور اس رفعت ذکر، تاثیر و صعود، رجوع خلائق، انقلاب حالات و حسن و تمتع دینی و روحانی کی عام تبدیلی پر نظر ڈالتا ہوں جو اس ایس ماہ کی دعوت سے ہر طرف پیدا ہوگئی ہے، اور پھر اس کے بعد خود اپنے تئیں دیکھتا ہوں اور اپنے اعمال پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے حکمت الٰہیہ کی ایک عجیب و غریب نیرنگی نظر آتی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ نتائج حسنہ میرے سامنے ہیں، وہ محض اصل دعوت کی صداقت و حقیقت کے برکات و انوار ہیں ورنہ خود میں اور میری نگاہوں میں ڈوبی ہوئی زندگی تو اس لائق بھی نہ تھی کہ ان نتائج عظیمہ کو کبھی خواب میں بھی دیکھتی۔" (الہلال جلد ۳ شمارہ ۵)

" الحمدللہ کہ میرے اعتماد نے مجھے دھوکا نہیں دیا اور اگر اعتماد کا یہ ایک ہی دروازہ بند ہو جائے تو پھر آسمانوں اور زمینوں میں انسان کے لیے کوئی جگہ اعتماد کی نہ رہے۔ مشیت ایزدی اس کی مقتضی ہوئی کہ الہلال نکلے اور جو کچھ اسے کرنا ہے، وہ کرے۔ پس وہ نکلا اور ایک بے پروا اور بے فکر روح کی طرح اپنے کاموں کو انجام دیتا رہا۔ نہ تو اس نے کسی سے مدد چاہی اور نہ کسی کی مدد قبول کی۔ نہ تو کاروبار کی طرح کبھی اپنے لیے فکر و جستجو کی اور نہ کبھی انسانوں کے آگے عاجزی کا سوال کیا اور نہ کبھی ان کے شکر کا ترانہ گایا۔ یہاں تک کہ اتنی قلیل مدت کے اندر جو اس طرح کے کاموں کے لیے ایک نہایت ناقابل ذکر مہلت ہے، اس کا بیج پھوٹا اور اس کی شاخیں اس قدر دور دور پھیل گئیں کہ ان کے خیال سے تعجب اور ان کے ذکر سے حیرانی پیدا ہوتی ہے۔

پس اب دیکھتا ہوں تو الہلال اپنا کام پورا کرچکا ہے اور اپنے بعض "مقاصد" کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ میں اس کی تفصیل نہیں کروں گا مگر صرف اتنا اشارہ کر دوں گا کہ وہ پہلا کام جس کی پکار تھی تا لوگ متوجہ ہوں اور راستہ صاف ہو۔ وہ لوگوں کی غفلت کو دور کرنا چاہتا تھا اور ان کے دلوں میں ان پرانی امیدوں کو زندہ کرنا چاہتا تھا جو افسوس ہے کہ بھلا دی گئی تھیں۔ وہ صرف "دعوت" تھی جو لوگوں کے اندر ایک نئی آرزو پیدا کرنا چاہتی تھی اور اپنی ملت کی حسیات اور عزمات میں خدا پرستی کی تڑپ اور دین الٰہی کی محبت اور اطاعت کا ذوق دیکھنا چاہتی تھی۔ الحمدللہ کہ تائید الٰہی سے یہ سب کچھ ہوچکا ہے اور الہلال کا کام اپنی پہلی "منزل دعوت" سے گزر چکا ہے۔" (الہلال جلد ۳ شمارہ ۱۲)

ہر چند الہلال کو ستمبر ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت داخل کرنی پڑی، پھر بھی یہ حسن قبول اور قبول عام کی منزلیں کامیابی کے ساتھ طے کر رہا تھا۔ ۱۹۱۴ء کے اوائل میں مولانا آزاد کو دو اہم ذاتی مسئلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک مسئلہ تھا الہلال کے لیے مالی وسائل کی فراہمی کا اور دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ بعض "دوسری منزلوں" کے لیے انھیں وقت اور فرصت کی ضرورت تھی جو الہلال کی مصروفیات کی وجہ سے ناپید ہو چکی تھی۔ ان میں سے پہلا مسئلہ ایسا تھا کہ مولانا کھل کر اس کا اظہار بھی نہیں کرسکتے تھے۔ مولانا کی غیور طبیعت دست طلب دراز نہیں کرسکتی تھی اور وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اپنے قارئین کا اعتماد حاصل کیے بغیر الہلال کی اشاعت بند کردیں۔ جولائی ۱۹۱۳ء سے دسمبر ۱۹۱۳ء تک انھوں نے الہلال کے اخراجات کیوں کر برداشت کیے، اس کا جو جواب بھی دیا جائے گا وہ قیاسی ہوگا۔ بہرحال وہ الہلال کو آب و تاب کے ساتھ شائع کرتے رہے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لیے جد و جہد کرتے رہے۔ مگر آخرش وہ لمحہ آہی گیا جب مولانا کو الہلال کے کالموں میں اپنے مسائل کا ذکر کرنا پڑا۔ انھوں نے بڑے کرب کے ساتھ لکھا:

"پس اب جو کہ الہلال اپنے مقصد کو پورا کرچکا ہے اور اپنی "پہلی منزل" سے گزر چکا ہے اور خود اس نے اپنے کاروبار کی جو مدت قرار دی تھی، وہ الحمدللہ کہ صرف اس کی ابتدا اور حسرت

ابر ویرحق کی قبولیت سے بلاست غیرے پوری ہو چکی ہے۔ اس لیے وقت آگیا ہے کہ احباب و مخلصین اور مومنین مجتہدین کے آگے الہلال کے آئندہ قائم رکھنے کے مسئلہ کو چند لفظوں میں صرف ایک بار پیش کر دیا جائے تاکہ وہ لوگ اس کی نسبت اپنے اندر رکھتے ہیں اور اس کے کاموں کو ملک و ملت کے لیے ضروری اور مفید یقین کرتے ہیں صرف وہی لوگ اس پر غور کریں اور ایک قطعی فیصلہ کرنے میں میرے ساتھ شریک ہو جائیں، خواہ اسے تکبر سمجھا جائے یا غرور بے جا، لیکن میں سچ سچ کہتا ہوں کہ اب بھی نہ تو کسی سے التجا ہے اور نہ کسی کے آگے سوال، نہ کسی پر بار ڈالنا مقصود ہے اور نہ کسی کے لیے بار خاطر بننا گوارا۔ میں تن تنہا بغیر دولت و ثروت، بغیر حصول اعانت، بغیر استمداد و استعانت اشخاص و جماعت، تمام مشکلوں کو برداشت کر کے اور تمام موانع و مصائب سے بے پروا رہ کے، محض نصرت الٰہی سے اپنا "پہلا کام" پورا کر چکا ہوں، اور اب میرے آگے "دوسری منزلیں" موجود ہیں اور ان کے لیے "الہلال" کے مالی نقصانات اگرچہ انتہائی حد تک پہنچ گئے ہیں اور مجھے تن تنہا ہونے کی وجہ سے اتنی محنت کرنی پڑتی ہے کہ میری صحت نے جواب دے دیا ہے اور میری آنکھوں کی بصارت یکایک ضعیف سے ضعیف تر ہو گئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ میں اب مستقل چار گھنٹے کام کرتا ہوں تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ اور رات کو جاگ کر کام کرنے کی میری محبوب و لذیذ عادت مجھ سے مفارقت چاہ رہی ہے۔ تاہم مجھ پر میرے خدا کا ایسا فضل و کرم ہے کہ اگر الہلال کا کام ناتمام رہا ہوتا اور مجھے میری "پہلی منزل" دکھائی نہ دیتی، تو اب بھی پوری خاموشی کے ساتھ برسوں کام کرتا رہتا اور کبھی بھی ان سرگذشتوں کے پڑھنے کی تمہیں تکلیف نہ دیتا۔" (الہلال: جلد ۴، شمارہ ۱۲)

مولانا آزاد نے قیام الہلال کے لیے مالی وسائل کا جو حل تلاش کیا تھا، خود ان کے الفاظ میں اس کی تفصیل یہ ہے۔

"اس کے مالی مسئلہ کی درستگی کی پہلی صورت یہ ہے کہ آئندہ سے اس کی قیمت بڑھا دی جائے چنانچہ اس کے لیے سواد میں الہلال کا بڑا حصہ بالکل تیار ہے، اور میرا اس عاجز کی تحریک اور خواہش کے صدہا بزرگوں نے خود بخود لکھا ہے کہ قیمت پندرہ روپیہ یا اقلاً بارہ روپیہ کر دی جائے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے لیے الہلال کی قیمت کی زیادتی کا خیال نہایت تکلیف دہ ہے اور بہت لوگوں کو مشقت دیتی تھی اس کی قیمت کو دوسرے ملکوں کی نظیر میں زیادہ کرنا کسی طرح گوارا نہیں ہو سکتا۔ میری کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح قیمت کم کی جائے، زیادہ تو کسی حالت میں نہ ہونی چاہیے۔

پس یہ صورت تو سردست نکال ہی دی جائے اس کے بعد الہلال کی توسیع اشاعت کا سوال آتا ہے اگر الہلال کو آئندہ کالت موجودہ قائم رکھنا ہے تو بس اسی صورت کو حل کرنا چاہیے۔ میں نے مصارف کے لیے جو بحث قرار دیا ہے اور حتی الامکان پوری کمی کی ہے کہ کم سے کم توقع ہے آئندہ الہلال نکل سکے بس اگر ہم کوشش کر کے الہلال کے لیے دو ہزار نئے خریدار پیدا کر سکیں جو آٹھ روپیہ سالانہ قیمت ادا کریں تو اس کے بعد یقیناً الہلال کا مالی مسئلہ بغیر قیمت کے بڑھائے حل ہو جائے گا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ہر صیغہ میں کافی وسعت اور ترقی ہو جائے گی۔

سردست یہی حل الہلال کے مالی مسئلہ کے عقدۂ مشکل کا ہے۔ اور چونکہ اس کی قیمت بہت کم اور مصارف نہایت زیادہ ہیں اس لیے موجودہ تعداد اشاعت میں اس کے نقصانات آئندہ کسی طرح برداشت نہیں ہو سکتے۔ میں ان تمام بزرگوں اور دوستوں کے سامنے جو الہلال کو آئندہ بھی اسی حالت میں بلکہ اس سے بھی بہتر حالت میں دیکھنے کی خواہش رکھتے ہیں، آخری مرتبہ اس حل کو پیش کر دیتا ہوں۔ اگر خدا کی مرضی ہوئی اور نئے خریداروں کی فراہمی کے لیے کوشش کی گئی تو میں الہلال کو موجودہ حالت سے بہتر حالت میں جاری رکھوں گا، اور اگر ایسا نہ ہوا تو نہ تو کسی کی شکایت ہے اور نہ کسی کے لیے گلہ نہ تو انسانوں پر اعتماد ہے اور نہ ان کی توجہ کی آرزو۔ میں اپنا "پہلا کام" کر چکا ہوں اور اب میرے لیے زیادہ تر عاجل کاموں کی "دوسری منزلیں" آنے والی ہیں۔ پس میں صرف انھیں کاموں میں مشغول ہو جاؤں گا۔ میرے پاس ایک ہی زندگی ہے اور میں نے بہت چاہا لیکن ایک زندگی بہت سے کاموں کے لیے تیار نہ ہو سکی اور اب تک جو کچھ ہوا، یہ محض اللہ کا ایک مخصوص فضل تھا۔" (الہلال۔ جلد ۴، شمارہ ۵)

۱۹۱۴ء کے اوائل میں الہلال کے مسئلہ قیام نے مولانا آزاد کو جس کشاکش میں مبتلا کر دیا تھا، اس کی جھلک سطور بالا میں دیکھی جا چکی ہے مگر وہ اس مسئلے کا قطعی حل پیش کرنے کے لیے بے چین تھے۔ الہلال کے قارئین کو دعوت دی گئی کہ وہ مولانا کی بعض تجاویز پر اپنے ردعمل کا اظہار کریں۔ ایک طرف مولانا الہلال کی مالی پریشانیوں کو دور کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف وہ "دوسری منزلیں" تھیں جو مولانا کو اہلاً و سہلاً مرحبا کہنے کے لیے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں بالآخر الہلال کی دو اشاعتوں (۸ جولائی ۱۹۱۴ء اور ۲۲ جولائی ۱۹۱۴ء) میں انھوں نے اپنے آخری فیصلے کا اعلان کر دیا جس کے الفاظ یہ ہیں:

"مسئلہ قیام الہلال کا اب تک میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکا ایک طرف ان کاموں کو دیکھتا ہوں جن کا وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے اور الہلال کی گرفتاری مہلت نہیں دیتی کہ ان کے لیے کافی وقت صرف کر سکوں۔ "حزب اللہ" کے متعلق تمام ابتدائی مراحل طے ہو چکے ہیں۔ کام شروع ہو چکا ہے اور آئندہ کاموں کے اجرا کے لیے ضرورت ہے کہ کم از کم چھ سات ماہ کلکتہ سے باہر رہا کروں اور تمام کاموں سے الگ ہو کر صرف اسی کے لیے وقف ہو جاؤں لیکن اگر ایسا کروں تو الہلال کو کس پر چھوڑ دوں

اگر کسی نہ کسی طرح جاری رکھا جائے تو سب سے پہلے سوال مالی مسئلہ کا سامنے آتا ہے۔ اس دو سال کے اندر مجھ سے جو کچھ ہو سکا خاموشی کے ساتھ روپیہ لٹاتا رہا۔ خدائے علیم ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح اب تک کام چلا ہے اور کس قدر مالی قربانیوں کے بعد اس کا ایک ایک نمبر نکالا گیا ہے؟ اب اقلاً اتنا تو ہو جانا چاہیے کہ جمع و خرچ برابر ہو جائے یا آئندہ نقصان بھی ہو تو کم ہو۔"

(الہلال۔ جلد ۵ شمارہ ۲)

"۱۔ بہر حال اب ناگزیر ہے کہ آئندہ سے ۱۲ روپیہ سالانہ قیمت قرار دی جائے۔

۲۔ دوسرے کاموں کے لیے علی الخصوص "حزب اللہ" کے لیے فرصت کا طالب ہوں، اور کسی طرح اب اپنی اس طلب سے باز نہیں آ سکتا۔

سردست اس کا یہی علاج ہے کہ حتی الامکان ایڈیٹوریل اسٹاف کو وسیع کرنے کی ایک اور کوشش کروں اور ساتھ ہی احباب کرام سے سال میں ایک ماہ کی فرصت بھی حاصل کروں۔

ایک ماہ کی فرصت سے مقصود یہ ہے کہ آئندہ سالانہ اشاعت گیارہ مہینے کا قرار پائے نومبر میں اس کی جلد ختم ہو جائے گی اور دسمبر میں کوئی نمبر (بغیر اشد ضرورت یا کسی اہم مسئلہ کے پیش آ جائے کے)

شائع ہوگا پہلی جنوری سے نئی جلد شروع ہوگی

یہ ایک ہیسہ کلکتہ سے باہر بسر کروں گا۔ اور الہلال کی طرف سے فارغ البال رہوں گا بعض پرچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ الہلال قاہرہ نے ایسا سال دس ماہ کا رکھا ہے" (الہلال جلد ۵ شمارہ ۳)

مولانا آزاد اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی اور الہلال کو انھوں نے اس جنگ کے عوامل و عواقب پر تبصرے کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے اپنے تبصروں میں برطانیہ کی جنگ جوئی کی مہم اور اس کی پسپائیوں کا کھل کر ذکر کیا۔ "سقوط الجیم" اور جرمنی کی فتح یابی پر ان کا زور قلم حدِ کمال کو پہنچ گیا تھا۔

وہ نومبر ۱۹۱۴ء میں الہلال کی پانچویں جلد ختم کر کے دسمبر ۱۹۱۴ء میں فرصت کے مہینے کے طور پر گذارنا چاہتے تھے کہ ان کا زور قلم رنگ لایا اور حکومت نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ نومبر کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی الہلال کی ضمانت ضبط ہوگئی اور ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کا شمارہ الہلال کا آخری شمارہ ثابت ہوا۔ ضمانت کی ضبطی کا حال الہلال کے کالموں سے یہاں نقل کیے جا رہے ہیں:

"بنگال گورنمنٹ نے ۱۶ نومبر ۱۹۱۴ء کو الہلال پریس کی دو ہزار کی ضمانت ضبط کرلی۔ الہلال کے دو نمبر مورخہ ۱۴ و ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۴ء کے جو ڈبل نمبر کی صورت میں ایک ساتھ شائع ہوئے تھے عمل میں آئے، بنگال گورنمنٹ نے جن مضامین کو قابلِ اعتراض قرار دیا ہے۔ وہ حدیث الحور "اور سقوط الحرب" ہیں ایک طبی تصویر بھی قابلِ اعتراض قرار دی گئی ہے جس کے نیچے قرآن حکیم کی یہ آیت درج ہے:

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ

سو، اتفاق سے مولانا اس وقت دورے میں تھے اور ان کی عدم موجودگی میں ضبطی و خانہ تلاشی کا وارنٹ آیا دفتر کی طرف سے ان کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو انھوں نے ہدایت فرمائی کہ "جو سرخیب رہا ہے، اس کو فوراً شائع کر دو" اور ایک مختصر نوٹ میں ضبطی کی اطلاع کے ساتھ یہ اعلان کر دو کہ ہم اپنی ذات سے آخر وقت تک "الہلال" کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور انشاء اللہ برابر رکھیں گے اس لیے ہم حسب ہدایت اس پرچہ کو شائع کر دیتے ہیں اور "الہلال" کی آئندہ زندگی کی قارئین کرام کو کامل توقع دلاتے ہیں۔ دس بقیہ مس رحمتہ اللہ اصالوں (۵۹۰، ۵۱) (الہلال جلد ۵ شمارہ ۲۰)

۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء جلد ۵ شمارہ ۲۰ پر الہلال کی اشاعت کا پہلا دور ختم ہوگیا لیکن مولانا آزاد ہین ستم ہائے روزگار رہتے ہوئے بھی الہلال کے خیال سے غافل نہیں ہوئے۔ وہ الہلال کا دورِ ثانی بھی شروع کرنا چاہتے تھے اور ساتھ ہی "دوسری منزلوں" کی طرف پیش قدمی کی تیاری میں بھی سرگرم تھے کوئی ایک سال کے بعد یعنی ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو انھوں نے الہلال کی جگہ البلاغ کا اجرا کیا اور "دوسری منزلوں" کا سفر بھی شروع کر دیا۔ انھوں نے "دارالارشاد" قائم کیا اور البلاغ کی اشاعت سے چند دن پہلے اس ادارے کا افتتاح بھی ہوگیا تھا مولانا دارالارشاد کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"گذشتہ سال ماہ رمضان المبارک میں (ملاحظہ تقویم جون، جولائی ۱۹۱۵ء) دارالارشاد کی بنیاد رکھی گئی چار سال بیشتر کا واقعہ ہے کہ مشیت الٰہی نے اس عاجز کی رہنمائی کی اور "الہلال" نے قرآن حکیم کی تبلیغ و دعوت کی صدا بلند کی لیکن اس عرصہ میں جو کچھ ہوا، وہ ایک دعوت عام تھی۔ تاہم اس دعوت کی دوسری منزل ابھی باقی ہے دارالارشاد کے قیام کا مقصد یہی ہے کہ دعوت الی القرآن کی اس دوسری منزل کا سروسامان ہو چنانچہ الحمدللہ کہ ماہ مقدس ذوالحجہ سے (ملاحظہ تقویم اکتوبر، نومبر ۱۹۱۵ء) دارالارشاد کا افتتاح ہوگیا۔"

(البلاغ جلد ۱، شمارہ ۱)

قرائن بتاتے ہیں کہ "البلاغ" کی اشاعت کے دوران مولانا آزاد "دوسری منزلوں" کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔ مالی وسائل کی کمی کا ذکر بھی ان شماروں میں ملتا ہے اور دوسرے امور میں مولانا کے قلم کی مصروفیات کا بھی۔ دراصل البلاغ کا دور ترجمان القرآن اور دوسری تصنیفات میں مصروفیات کا دور ہے۔ وہ البلاغ کے تیسرے شمارے (۱۰ دسمبر ۱۹۱۵ء) میں لکھتے ہیں:

"البلاغ" جاری ہوگیا ہے مگر ہمیں جو کچھ کہنا تھا، وہ اب تک باقی ہے، اور شاید ہمیشہ باقی رہے دارالارشاد کے اجراء، رسائل تصنیف و تالیف کی غیر معمولی تیاری، ترجمۃ القرآن اور تفسیر کی ترتیب و اشاعت اور بعض دیگر اسباب و موانع کے ہجوم میں اسی کو غنیمت سمجھا گیا کہ کسی نہ کسی طرح پرچہ جاری ہو جائے بہرحال رسالہ تو جاری ہوگیا، مگر اب تک لکھنے کا موقع بالکل نہیں ملا

سب سے پہلے ہمیں ماضی قریب کا وہ حصہ بے اختیار یاد آجاتا ہے جو "الہلال" کے بند ہونے کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور پھر یہ سال (۱۹۱۵ء) کے تمام ابتدائی دو سلسلے حصے سے گذر کر گذشتہ اگست میں ایک طرح ختم ہو جاتا ہے جب کہ "الہلال پریس" کی ضمانت ضبط کی گئی ہے اور اس کے لیے دو ہزار کے بعد دس ہزار روپے کی سرل کھولی گئی ہے تو اس وقت یہ واقعہ کوئی پہلا واقعہ نہ تھا لیکن دعوت و تبلیغ کی راہ، صرف اخبار نویسی کی راہ سے دیکھو کہ یہ تو ایک ستاج ہے) ملک میں تجارت اور اقتصاد سود و زیاں کی راہ سے بالکل مختلف ہے تجارت نے اپنا مذہب "نوس و بدل" کے عقیدے پر قائم کیا ہے۔ اور "دعوت" کے مذہب کا پہلا عقیدہ ایثار اور "قربانی" ہے۔ تاجر اگر "پانے" کو اپنا معشوق بنائے تو اپنی ہستی کھودے اور داعی اگر "کھونے" کے عشق سے ایک لحہ کے لیے بھی غافل ہو تو اس پر لذت دعوت حرام ہے۔"

تجارت اور دعوت کے فرق کو البلاغ کے اگلے شماروں میں بھی واضح کیا گیا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی باقاعدہ اشاعت کے موانع میں سرمایہ کی کمی بھی تھی اور مولانا کی دیگر مصروفیات بھی۔ پہلے تین شمارے تو باقاعدہ نکلے، اس کے بعد مشترکہ شماروں کا سلسلہ شروع ہوا، شمارہ چار، پانچ بھی مشترکہ تھا اور شمارہ چھ اور سات بھی مولانا کو اس کمی کا احساس تھا ہرچند انھوں نے کئی معذرتی تحریریں شائع کیں لیکن وہ اس پر قابو نہیں پاسکے نمبر چھ اور سات کے مشترکہ شمارے میں وہ لکھتے ہیں

" البلاغ کی اشاعت میں اب تک بجائے بدنظمی رہی ابتدا میں ارادہ کیا تھا کہ کچھ دنوں تک مہینے میں دو بار شائع کیا جائے اور اس طرح جو وقت اس سے بچے، وہ تصنیف و تالیف میں صرف ہو لیکن تجربے سے ثابت ہوا کہ اپنے لیے ایام اشاعت کی ہر صورت یکساں ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ اب تک پیچھے بعد دیگرے کچھ ایسے افکار و حالات گرد و پیش رہے جن کی وجہ سے طبیعت برابر بھی رہی اور اہاک دعوت عمل کا سلسلہ نہ چھوڑ سکا اب تک یہ حال رہا ہے کہ البلاغ کی تحریر و ترتیب میرے لیے وہ لذت و کیفیت ہی نہ تھی۔

و اپنے ذوق و شوق کے تمام کاموں میں پاتا ہوں ۔ لیکن الحمد للہ کہ میرے دل کی افسردگیوں کا موسم اب بدل گیا ہے ۔ اب میں مستعد ہوں کہ اپنا کس قدر وقت البلاغ کے لیے نکالوں ذوق و انہماک کے ساتھ ترویج کروں۔"

مولانا کی یقین دہانیوں کے باوصف البلاغ میں باقاعدگی نہیں آسکی۔ شمارہ نمبر آٹھ اور نو بھی مشترکہ نکلا صرف شمارہ نمبر دس، شمارہ نمبر گیارہ اور شمارہ نمبر بارہ کی اشاعت آزادانہ عمل میں آئی مگر اس کے بعد دو شماروں میں اتنی بے قاعدگی آگئی کہ شمارہ نمبر ۱۳ اور ۱۴ مشترکہ تھا اور آخری شمارہ نمبر ۱۵، ۱۶، ۱۷ اور ۱۸ پر مشتمل تھا۔ مولانا نے دل کی افسردگیوں کے موسم میں جس تبدیلی کا مژدہ سنایا تھا، وہ صحیح نہیں تھا۔ ضمانت الہلال کی ضبطی کا واقعہ تو مولانا کے قلم کی ضبطی کی ایک تمہید تھی۔ حکومت فیصلہ کرچکی تھی کہ اب مولانا کو اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ آخرش مولانا کے الفاظ میں:

"۲۰ مارچ [۱۹۱۶ء] کو گورنمنٹ بنگال کا حکم زیر دفعہ ۳، ڈیفنس ایکٹ پہنچا کہ میں چار دن کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کردوں اور حدود بنگال سے باہر چلا جاؤں بعد کو یہ مدت ایک ہفتہ تک بڑھادی گئی۔[1] اس سے پہلے گورنمنٹ دہلی، پنجاب اور متحدہ اپنے اپنے صوبہ میں آنے سے روک چکی ہیں۔

ترکِ وطن اور ذہاب الی اللہ تو وہ منزلِ محبوب و مطلوب ہے جس کا منزلِ تبلیغ و دعوت کے بعد پیش آنا ہر دعوت کے فطاطور کے لیے ناگزیر ہے۔

میں نے ابتداء اشاعتِ الہلال سے لے کر اس وقت تک جو کچھ لکھا اور کہا ہے، اس کا حرف حرف زمانے کے علم و حافظہ میں محفوظ ہے۔ میں نے ابتدا سے لے کر اس وقت تک ایک ہی اعلان کیا اور اسی اعلان کے نتائج و ثمرات ہیں جو مجھ کو اپنے اعمال و اشغال کی ہر شاخ میں نظر آئے۔

۔ اس کے فضل و کرم کی بخششوں اور نعمتوں میں سے سب سے بڑی اور سب سے آخری نعمت وہ ہے جو اس نے موجودہ واقعہ کے اندر پوشیدہ رکھی ہے یعنی البلاغ کی دعوت تبلیغ کو اس کی دوسری منزل تک عروج و رفعت بخشی گئی اور مقام ذہاب الی اللہ و ترکِ وطن پیش آیا:

یہ جو کچھ تھا کلمۂ حق و عدل کی دعوت و تبلیغ کی سرگزشت تھی جو الحمد للہ والمنۃ کہ اپنی دوسری منزل تک پہنچ گئی ہے۔"

مولانا نے جس خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی اس پہلی جلاوطنی کا خیر مقدم کیا، سطور بالا اس کی شاہد ہیں۔ اعلائے کلمۃ الحق کے اس انجام سے مولانا واقف تھے، اس لیے کسی پس و پیش کے بغیر انھوں نے کلکتے کے قیام کو ترک کردیا اور رانچی کو اپنا مستقر بنایا۔ کلکتہ مولانا کے ذوق و شوق کا محور و مرکز تھا وہ چھوٹا تو البلاغ نے بھی آخری سانس لی اور ۱۷، ۲۴، ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء کا مشترکہ شمارہ آخری شمارہ ثابت ہوا۔ البلاغ کے سرورق پر ۱۷ اور ۲۴ مارچ کی تاریخ درج ہے۔ لیکن اس کے اندرونی صفحات میں مذکورہ تاریخوں کے علاوہ ۳۱ مارچ کا بھی اضافہ ہے۔ البلاغ کا آخری نمبر شمارہ ۱۸ ہے لیکن دراصل ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء تک اس کے صرف ۱۱ شمارے شائع ہوئے۔

مولانا آزاد نے رانچی میں چند مہینے جلاوطنی کے بہانے گذارے اور پھر وہیں حکومت ہند نے انھیں نظر بند کردیا۔ الزام یہ تھا کہ یہ حکومت کے دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اس جلاوطنی اور نظر بندی کا جو ردِعمل مولانا پر ہوا، اس کی ایک جھلک خود ان کے الفاظ میں دیکھیے:

"۱۹۱۶ء میں جب یہ معاملہ پیش آیا تو مجھے پہلی مرتبہ موقع ملا کہ اپنی طبیعت کے تاثرات کا جائزہ لوں۔ اس وقت عمر کے صرف ستائیس برس گزرے تھے "الہلال" "البلاغ" کے کام جاری تھا۔ دارالارشاد قائم ہو چکا تھا۔ زندگی کی گہری مشغولیتیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ طرح طرح کی سرگرمیوں میں دل اٹکا ہوا تھا اور علائق اور واسطوں کی گرہوں سے بوجھل تھا۔ اچانک ایک دن دامن جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہونا پڑا اور مشغولیت کی ڈوبی ہوئی زندگی کی جگہ قید و بند کی تنہائی اور بے تعلقی اختیار کرلینی پڑی۔ بظاہر اس ناگہانی انقلاب حال میں طبیعت کے لیے بڑی آزمائش ہونی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ نہیں ہوئی۔ آباد گھر چھوڑ کر ویرانے میں جا بیٹھ رہا

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب   دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

۔ علائق کا فوری انقطاع، کاروبار کی ناگہانی برہمی، مشغولیتوں کا یک قلم تعطل — کوئی بھی بات دامنِ دل کو کھینچ نہ سکی۔ کلکتے سے اطمینان تمام نکلا اور رانچی شہر کے باہر ایک غیر آباد حصے میں مقیم ہوگیا لیکن پھر جوں جوں دن گزرتے گئے طبیعت کی بے پروائیاں جواب دینے لگیں اور صورتِ حال کا ایک ایک کانٹا پہلوئے دل میں چبھنے لگا۔ یہی وقت تھا جب مجھے اپنی طبیعت کی اس اصحابی حالت کا مقابلہ کرنا پڑا اور ایک خاص طرح کا سانچا اس کے لیے ڈھالنا پڑا۔ اس وقت سے لے کر آج تک کہ چھبیس برس گذر چکے ہیں، وہی سانچا کام دے رہا ہے۔ اور اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ ٹوٹ جاسکتا ہے، مگر لچک نہیں کھاسکتا ہے۔" (غبارِ خاطر، ۵۵)

الہلال کی ضمانت کی ضبطی کے بعد ہی مولانا آزاد کی دوسری مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ ان مصروفیات میں مختلف کتابوں کی تحریر و تسوید کے علاوہ ملکی سیاست میں ان کی گہری دلچسپی بھی شامل تھی۔ البلاغ کو بھی وہ زیادہ وقت نہیں دے سکے اور اسے اپنے ذوق و شوق کے مطابق ابھی مرتب نہیں کرسکے تھے کہ جلاوطنی اور نظر بندی نے اس سلسلے کو ختم کرکے دم لیا۔

مولانا آزاد رانچی کی نظر بندی سے پہلی جنوری ۱۹۲۰ء کو رہا ہوئے اور ان کی ملاقات گاندھی جی سے ہوگئی۔ تحریک خلافت اپنے شباب پر تھی، مولانا پورے زور و شور کے ساتھ اس میں شامل ہوگئے۔ یہاں ان کی سیاسی مصروفیات کا ذکر مقصود نہیں، وہ تو اتنی زیادہ تھیں کہ مولانا کسی رسالے کی اشاعت کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے۔ (مولانا آزاد کی نگرانی میں اور عبدالرزاق ملیح آبادی کے زیرِ ادارت ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہفتہ وار "پیغام" کلکتہ کا پہلا شمارہ شائع ہوا مگر اس کے صرف گیارہ شمارے نکلے ۱۹ دسمبر ۱۹۲۱ء کو اس کا آخری شمارہ شائع ہوا)

---

[1] ۷ اپریل ۱۹۱۶ء کو حکومتِ بنگال نے ڈیفنس آرڈیننس کے تحت مجھے بنگال سے خارج کردیا تھا میں رانچی گیا، دو مہینے بعد ماہر ... میں مقیم ہوگیا پھر گورنمنٹ ... نے وہیں قید کردیا پھر اس کا سلسلہ ... تک جاری رہا (غبارِ خاطر حاشیہ ۵۲)

پھر بھی مولانا کے دل میں رہ رہ کر ٹیس اٹھتی تھی اور وہ حالات پر قابو پانا چاہتے تھے کہ الہلال کی اشاعت شروع کی جاسکے۔ اس بارے میں انھوں نے اس وقت تفصیل سے اظہار خیال کیا جب تقریباً گیارہ سال کی طویل مدت کے بعد انھوں نے الہلال تیسری مگر آخری بار جاری کیا۔ انھوں نے اس آخری دور کے پہلے شمارے میں (۱۰ جون ۱۹۲۷ء) لکھا:

"الحمد للہ والمنہ الہلال کا پہلا نمبر جون ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا۔ الہلال کے پہلے شمارے پر ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کی تاریخ ہے اور آخری نمبر نومبر ۱۹۱۴ء میں۔ پھر نومبر ۱۹۱۵ء سے دوسرا سلسلۂ اشاعت "البلاغ" کے نام سے شروع ہوا اور مارچ ۱۹۱۶ء میں ختم ہو گیا۔ اب یہ تیسرا سلسلۂ اشاعت ہے جو کامل گیارہ برس کے بعد از سر نو شروع ہو رہا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ۱۹۲۰ء کے اواخر سے لے کر گذشتہ ستمبر تک کوئی خیال بھی میرے ذہن سے اس قدر بعید نہ تھا جس قدر الہلال کی سہ بارہ اشاعت اور اس کی ذمہ داریاں قبول کرنے کا خیال تھا۔ میری شخصی زندگی اور اس کی احتیاجات پر قومی و ملی مقاصد اور ان کا تقاضہ، دونوں اس بات کے مخالف تھے کہ الہلال جیسے رسالے کی ہفتہ وار اشاعت کی ذمہ داری تیسری مرتبہ اپنے اوپر لیتا۔ جہاں تک میری شخصی حالت کا تعلق ہے، سب سے پہلے سوال صحت کا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ روز بروز گرد رہی ہے، اور یہ زندگی کی ابتدائی احتیاطوں کے خلاف ہوگا اگر ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء کی محنتیں پھر اس کے لیے مہیا کی جائیں۔ قومی و ملی مقاصد کا یہ حال تھا کہ بعض اہم تصنیفات کی تکمیل و اشاعت عرصے سے ملتوی چلی آتی تھی، اور الہلال جیسے رسالے کی ہفتہ وار اشاعت کا بار اٹھا لینے کے بعد مشکل تھا کہ ان کے لیے فراغ حاصل میسر آسکتا۔ اس کے علاوہ طبع و فکر کی کام جوئیوں اور طلب و نظر کی وسعت پیمائیوں نے بے شمار ارادے جہاں جانۂ دل میں جمع کر رکھے تھے ان سب کے لیے بھی اوقات فراغ کی ضرورت اور خلوت و سرد اکی جستجو تھی یہی وجہ ہے کہ جنوری ۱۹۲۳ء میں جب قید خانے سے نکلا تو اس بارے میں ایک طے شدہ ارادہ اپنے سامنے رکھتا تھا۔ خیال تھا کہ جوں ہی وقت کی سیاسی مشغولیت مہلت دے گی، پہلا کام یہ کروں گا کہ چار پانچ سال کے لیے کسی ایسے گوشے میں کہ صحت کی درماندگیوں کے لیے سود مند اور جمعیت خاطر و عمل کی موجودگی سے دل پسند ہوگا، مقیم ہو جاؤں گا اور اپنے مقاصد علمی و ملی کی مشغولیت و تکمیل کے سوا اور کسی کام سے علاقہ نہیں رکھوں گا۔

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے!

احباب و مخلصین میں جن حقیقت شناسوں کی نظر ان کاموں کی اہمیت پر تھی وہ تو اسی کے متمنی تھے، لیکن عام طور پر لوگوں کو طلب الہلال کی تھی۔ کوئی وقت بھی اس کی طلب و اصرار سے خالی نہیں جاتا تھا۔ تاہم میری طبیعت کا یہ حال تھا کہ کسی طرح بھی اس کے لیے آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ تمام تر جستجو اسی بات کی تھی کہ فراغ خاطر اور یکسوئی جمع کے ساتھ اپنی علمی زندگی میں مشغول ہو جاؤں۔ اور ان ارادوں کی تکمیل کی سعی کروں جو مدتوں سے وقت اور مہلت کے منتظر ہیں۔

لیکن اس تمام طلب و جستجو کا مآل آخر یہ نکلا، یہ نکلا کہ وقت کے تقاضے، احباب کے پیہم اصرار، اور التوا و انتظار عمل کی ناقابل برداشت حالت سے عاجز آکر مشغولیت کی وہی صورت اختیار کرلینی پڑی جس سے سالہا سال تک اس درجہ گریزاں تھا یعنی فیصلہ کرنا پڑا کہ الہلال جاری کر دیا جائے۔

مختصر یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے اس طرح کے حالات پیش آتے رہے کہ وقت عمر اپنی تیز رفتاری میں کبھی ہمارے حالات کی پروا نہیں کرتا، برابر نکلتا گیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے ۱۹۲۳ء کی جگہ ۱۹۲۷ء کا جاڑا سامنے آگیا۔

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اب بھی طبیعت کا میلان کسی ایسی ذمہ داری قبول کرنے کی طرف نہ تھا لیکن انسانی طبیعت کے انفعال و تاثر کا کچھ عجیب حال ہے گذشتہ ستمبر میں انتقال کے لیے دریے التوا اور ملک کی اجتماعی و دینی ضروریات کے تقاضے سے طبیعت کچھ اس طرح متاثر ہوگئی کہ جب ایک موقع پر بعض دوستوں نے بہ شدت خصوصیت کے ساتھ الہلال کی اشاعت پر زور دیا اور اس کی ضرورت کے مختلف پہلوؤں پر توجہ دلائی تو طبیعت انکار کی طرف مائل نہ ہو سکی۔ خیال ہوا کہ میرے ذاتی حالات کا مقتضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، لیکن ترجیح وقت کی ضرورت ہی کو ہے، اور کام کرنے والوں کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کے سامنے سر تسلیم کر دیں۔

ایک حقیقت نا قابل و اضح تھی اور اس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ اگر ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء میں الہلال ضروری تھا تاکہ مقصد و عمل کی سد و راہ قوم پر کھول دے تو ۱۹۲۷ء میں بھی وہ کم ضروری نہیں ہے تاکہ سعی کی سخت تر شب تاریک اور پُر خطر مرحلے میں وقت کی رہنمائی کرے۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ اگر تقسیم عمل کے حقداروں سے اس ضرورت کا کوئی دوسرا انتظام موجود نہیں تو چاہیے کہ اپنی تمام ناتوانیوں اور درماندگیوں کے ساتھ ضرورت و عمل کے مختلف گوشوں میں جس قدر بھی کام کر سکتے ہیں کرتے رہیں۔ اتفا کو کوشش سے بار آئیں۔ سعی کی تکمیل اور توفیق کی مساعدت مشیت الٰہی کے فیصلہ پر موقوف ہے، اور جو اس کے کرنے کی چیز ہے وہ اس کے حوالے کر دینی چاہیے۔

الہلال کے تیسرے دور کا پہلا پرچہ شائع کرتے ہوئے مقتضائے وقت نے فکر و تصور کے ہر گوشے میں گستن پیدا کر دی ہے۔ افکار و مطالب کا ہر طرف سے ہجوم ہے۔ قلم کی درماندگی اور گنجائش اوراق کی کوتاہی کسی طرح بھی اس کا ساتھ نہیں دے سکتی جی چاہتا ہے گیارہ سال کی خاموشی کی تلافی ایک ہی مجلس میں کر دیجیے۔

روی یار ار مراد ا مردر عرق ماست | دیدۂ تر گی مردم و دامن تر گی حسرم را

لیکن مشکل یہ ہے کہ طبیعتیں طوالت بیان کی متحمل نہیں اور رشتۂ بیاں کا یہ حال ہے کہ ایک مرتبہ کھل جائے تو جلد لپیٹا نہیں جا سکتا۔

این رشتہ نا گسستہ بیچی کہ دراز است!

مجبوراً قلم روکتا ہوں!"

الہلال کی اشاعت ثانیہ کا عام طور پر خیر مقدم کیا گیا، مولانا نے اس میں بعض نئے موضوعات کا اضافہ بھی کیا۔ برید شرق اور برید فرنگ کے کالموں کو زیادہ دلچسپ اور معلوماتی بنایا گیا، کتابوں پر تبصرے کے لیے "مطبوعات جدیدہ" کا مستقل باب قائم کیا گیا جس میں غیر ملکی مطبوعات پر بھی تعارفی نوٹ لکھا جاتا تھا۔ دوسری زبانوں سے اچھے لٹریچر

کے تراجم کا کام بھی وسیع پیمانے پر شروع کیا گیا۔ اس دورِ ثالث کی ایک خاص بات یہ ہے کہ (شروع کی چند اشاعتوں کو چھوڑ کر) نصف پرچہ ٹائپ میں چھپتا تھا۔ اور نصف نستعلیق میں اور پھر مولانا نے مختلف طرز کے ٹائپ کے حروف پر قارئین کو اظہارِ خیال کی دعوت بھی دی تھی۔ مولانا نے اس دور میں ادبیات کے کالم کے علاوہ افسانہ کا کالم بھی شامل کیا۔ غرض اس عہد کے الہلال کو متنوع بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی (اور نومبر ۱۹۱۳ء کے شمارے تک کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ الہلال کا حرفِ آخر ہے اور پھر کبھی نہیں نکلے گا) لیکن ہمیں شذرات اور مقالہ افتتاحیہ کی کمی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ دراصل دورِ اوّل کے الہلال کے یہ عنوانات مولانا کے زورِ قلم کے ترجمان ہوتے تھے۔ اسی کو جانِ الہلال کہیے اور عہدِ ثالث سے یہی جان سلب کر لی گئی تھی۔ مولانا کی طویل علالت اور ان کی سیاسی مصروفیات کو اس کے اسباب میں شمار کرنا چاہیے۔ پرچے کے معیار میں کوئی کمی نہیں مگر قارئین تو مولانا کی تحریریں دیکھنا چاہتے تھے۔ بہرحال الہلال جاری تھا اور ۹ دسمبر ۱۹۱۳ء کو عہدِ ثالث کی پہلی جلد ختم ہو گئی۔ اسی شمارے میں دو اعلانات شائع ہوئے تھے جن میں الہلال کے مستقبل کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ اور یہ امید تھی کہ نئی ششماہی کے شمارے کچھ اور ترقی یافتہ شکل میں سامنے آئیں گے۔ ایک اعلان میں مینیجر نے کہا تھا کہ ۹ دسمبر ۱۹۱۳ء کا شمارہ موجودہ ششماہی کا آخری شمارہ ہے اور اب ۷ جنوری ۱۹۱۴ء کو نئی ششماہی کا پہلا شمارہ شائع ہوگا۔ دوسرا اعلان مولانا آزاد کی طرف سے شائع ہوا تھا جس میں الہلال کے بدلِ اشتراک، کاغذ اور سامانِ طباعت وغیرہ کی گرانی کے ذکر کے ساتھ مندرجہ ذیل عبارت بھی شامل تھی:

"(۱) مجھے ندامت کے ساتھ اس کا اعتراف ہے کہ الہلال کی اشاعت کے وقت صورتِ حال کا جو اندازہ کیا تھا، وہ کئی اعتبار سے صحیح ثابت نہیں ہوا۔ سب سے زیادہ مجبوری صحت کی طرف سے پیش آئی۔ میں نے جب جب ارادہ کیا کہ الہلال کے لیے کافی وقت نکالوں، صحت کی فوری ناموافقت دامن گیر ہوئی اور قدم اٹھا کر پھر رک جانا پڑا۔

(۲) میں ان دوستوں کا خصوصیت کے ساتھ شکر گزار ہوں، جو زیادہ تر میرے خاص مضامین کے شوق میں الہلال کی ورق گردانی کرتے تھے تاہم انھوں نے رشتۂ انتظار ہاتھ سے نہ چھوڑا اور برابر مطالعہ جاری رکھا۔ اگر میرے خاص مضامین کی قلت رہی ہوتی تو بہ حیثیتِ مجموعی الہلال کے مضامین کی کثرت اور تنوع کا جو انداز یکساں طور پر برابر قائم رہا ہے، وہ اس کے لیے کافی تھا کہ میں اس موقع پر معذرت کی ضرورت محسوس نہ کرتا۔

(۳) بہرحال ان دوستوں نے محسوس کر لیا ہوگا کہ جوں ہی پچھلی بیماری سے مجھے تھوڑی بہت مہلت ملی میں نے الہلال کے لیے لکھنا شروع کر دیا اور اب امید ہے کہ توفیقِ الٰہی سے یہ سلسلہ مزید ترقی و توجہ کے ساتھ جاری رکھ سکوں گا۔ افسوس ہے کہ وقت کے حالات و مسائل کے متعلق بے شمار ضروری باتیں شرح و بسط کے ساتھ لکھی تھیں جو نہ لکھی جا سکیں۔ اب اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ جو کچھ ماضی میں نہ ہو سکا اس کے لیے مستقبل کی طرف نظر اٹھائی جائے!"

یہ کسے معلوم تھا کہ مندرجہ بالا بشارت الہلال کے حرفِ آخر کی شکل اختیار کرے گی۔ ۹ دسمبر ۱۹۱۳ء پر الہلال کی پہلی ششماہی ختم ہو گئی اور امید تھی کہ ۷ جنوری ۱۹۱۴ء سے نئی ششماہی کا آغاز ہوگا مگر پھر یہ بات قوت سے فعل میں کبھی نہیں آئی۔ فعل کی بات تو بعد کی ہے، قوت ہی معدوم ہو گئی۔ پھر کبھی مولانا نے الہلال کی اشاعت نو کی بات ہی نہیں کی۔ اس زمانے میں جو سیاسی حالات تھے اور مولانا جس حد تک اس میں شریک ہو چکے تھے، اس کا فطری تقاضا یہی تھا کہ مولانا الہلال کی اشاعت سے دستبردار ہو جائیں۔ مولانا کی نگرانی میں الہلال جاری رہ سکتا تھا لیکن لوگ مولانا کی تحریریں دیکھنا چاہتے تھے، دوسروں کے رشحاتِ قلم کے وہ محتاج نہیں تھے۔

ہر چند الہلال کا دورِ اوّل ارتقا کی ابتدائی کڑیاں تھیں لیکن یہی ابتدائی کڑیاں تاریخ میں اپنا مقام بنا چکی تھیں۔ اس کا دورِ ثانی (البلاغ) بھی بڑی حد تک دورِ اوّل کا ضمیمہ ہے لیکن دورِ ثالث اپنی تمام تر صوری خوبیوں اور معنوی تنوع کے باوصف دورِ اوّل کا بدل نہیں بن سکا۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مولانا کے پاس اس کی ترتیب تہذیب کے لیے وقت نہیں تھا۔

مولانا آزاد الہلال کی ترتیب و تہذیب میں کتنا وقت صرف کرتے تھے اور اسے خوب سے خوب تر بنانے کے لیے کتنی دلچسپی لیتے تھے، اس کا اندازہ درج ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے۔ ہر چند ان اقتباسات کا سیاق و سباق کچھ مختلف ہے لیکن مطلوبہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے:

"جس وقت الہلال جاری نہیں ہوا تھا، اس وقت تک بھر بھی دن کے چند گھنٹے اور رات کا ایک پہر گوشہ گیری کے لیے میسر آ جاتا تھا لیکن الہلال کا ابھی اعلان ہی شائع ہوا تھا کہ مصائب و آلام کا بھی ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا، اور جو کچھ میسر تھا وہ بھی ابنائے عالم کی یادوں میں چھین لیا گیا۔ ناظرین نے ہمیشہ اچھی بری صورت میں الہلال کا ہر نمبر اپنے سامنے موجود پایا ہے، انھیں کیا معلوم کہ وہ کیسے عالم اور کس حال میں مرتب کیا جاتا تھا؟ جن مضامین کے حسن و قبح کی نسبت وہ رائے قائم فرما رہے ہوں گے، انھیں معلوم نہیں کہ ان میں سے اکثر مضمون بسا اوقات رات کے دو تین بجے ایک بستر مریض کے قریب بیٹھ کر اس حالت میں لکھے گئے ہیں جب کہ دل تعبِ علائق پرستی کی کدورتوں سے بے قرار اور دماغ مسلسل شب بیداریوں کی وجہ سے قلم کے اختیار میں نہ تھا۔ اکثر اوقات ایسا ہوا ہے کہ اخبار کی اشاعت کے وقت میں صرف ایک رات کا وقفہ باقی رہ گیا ہے اور کچھ نہ ہوا تو رات بھر رو کر بیمار و تیمار دار دماغ پر جبر کیا گیا ہے کہ رات کے چند گھنٹوں کے اندر صفحہ (۲) سے (۸) تک کا مضمون تیار کر دے علی الخصوص گذشتہ ماہ صیامِ مبارک جس عالم میں بسر ہوا، اس کی حالت صرف اس علیم و خبیر ہی کو معلوم ہے، جس کو شاید اپنے بندوں کی ابتلا و آزمائش سے بڑھ کر اور کوئی بات پسند نہیں۔" (الہلال جلد ۱ شمارہ ۲۲)

"میں اپنے تمام کاموں کو تنہا انجام دیتا ہوں ۔۔ مجھے ایک ہی وقت کے اندر مختلف ذوق، مختلف الشرب بجر، مختلف افکار اور مختلف مطالعہ و نظر کے بیسیوں کام انجام دینے پڑتے ہیں، اور وارالارشاد کا سلسلہ اور اپنی زندگی کی الجھنیں ان کے علاوہ ہیں۔ اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کاموں کے اہتمام و تکمیل کے متعلق ارادے کرتا ہوں مگر میرا اندازہ بالکل غلط نکلتا ہے اور بیسیوں غیر متوقع موانع نکل آتے ہیں۔ اگر میں کسی دن چند گھنٹوں کے لیے بیمار پڑ جاتا ہوں تو یکایک دس بارہ کام رک جاتے ہیں اور اس کے سوا چارہ نظر نہیں آتا کہ ابھی ہلاکت گوارہ کر لوں مگر کاموں میں خلل نہ پڑنے دوں۔" (البلاغ: شمارہ ۱۲، ۱۳)

دراصل مولانا آزاد کا دوسرا نام "الہلال" تھا۔ لوگ الہلال کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ اس میں مولانا کے حسنِ ذوق، حسنِ خیال اور حسنِ قلم کا پرتو نظر آتا تھا۔ اگر الہلال کا کوئی شمارہ مولانا کی تحریر سے عاری رہتا تھا تو وہ کچھ سادہ اور سپاٹ معلوم ہوتا تھا۔ مولانا کو خود اس کا احساس تھا اور انھوں نے بارہا اس باب میں معذرت پیش کی۔ الہلال کے تیسرے دور کی اشاعت مولانا کی خلش دور نہیں ہوئی اور ہوتی بھی تو کیوں کر۔ مولانا کی سیاسی مصروفیات بڑھتی چلی گئیں اور انھیں الہلال کی ترتیب کے لیے وہ فرصت نہیں ملتی تھی جو انھیں اس کے دورِ اوّل میں نصیب تھی۔ الہلال کا دورِ اوّل مولانا کا نظریہ بھی تھا، ان کا جوش و ولولہ بھی اور ان کا مشغلہ و دائرہ کار بھی۔ وہ جو کچھ سوچتے تھے، ان کا قلم اسے الہلال کے پیکر میں ڈھال دیتا تھا۔ وہ عملی سیاست میں دخیل تھے لیکن صرف اس حد تک کہ الہلال کی اشاعت اس سے متاثر نہ ہوسکے لیکن گیارہ سال کے طویل عرصے کے بعد جب الہلال کا تیسرا دور شروع ہوا تو مولانا سیاست کے جرولاینفک بن چکے تھے۔ وہ چاہتے بھی تو اس سے الگ نہیں ہوسکتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر علم و ادب کے پرستار تھے اور اسی کوچے میں رہنا بھی چاہتے تھے۔ پہلے تو انھوں نے کوشش کی کہ سیاست اور علم کو ساتھ رکھیں مگر سیاست قدرِ غالب کی حیثیت اختیار کرتی گئی۔ کتنی حسرت کے ساتھ انھوں نے یہ الفاظ لکھے تھے:

"علم کی زندگی سیاست کی زندگی سے کچھ اس طرح مختلف واقع ہوئی ہے کہ دونوں کا ایک وقت اور ایک محل میں جمع ہونا بہت مشکل ہے۔ میری زندگی کی مشکلات میں ایک مشکل یہ واقع ہوئی کہ میں نے چاہا کہ دونوں کو ایک وقت اور ایک محل جمع کر دوں علم کا استغراق اور سیاست کی سرگرمیاں، دنیا کہ یہ متضاد ہوں تو ہوں لیکن میرے لیے تو ایک دماغ کا سودا اور ایک ہی دل کی تپش تھی لیکن اس کارخانۂ طبیعت میں کوئی تدبیر بھی ایسے قدرتی قواعد معطل نہیں کر دے سکتی۔ برق کے لیے گرنا اور خرمن کے لیے جلنا ناگزیر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ایک طرف ذوقِ علم کا عذر اور قلم کے انتظار لگا رہا تھا تو دوسری طرف سیاسی مشغولیت کی آتش افروزیاں بھی اپنے کام میں سرگرم تھیں۔

سماعے جمع کن شاید کہ عارت گر شود پیدا"

الہلال میں جو تنوع تھا اور منزل بہ منزل اس میں جو ہمہ جہتی آتی گئی، بلاشبہ وہ مولانا آزاد کے خونِ جگر سے عبارت ہے لیکن اتنے وقیع اخبار یا جرنل کا ہر کام مولانا تنہا نہیں کر سکتے تھے، اس کے لیے ایک ادارۂ تحریر کا قیام فطری بھی تھا اور لازمی بھی۔ مولانا کے ذہن میں اردو صحافت کا جو تصور تھا، اس کا ماضی سے یا روایت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ الہلال کو انگریزی کے کسی معیاری جرنل کے پس منظر میں دیکھ رہے تھے۔ وہ بعدی افادی کے اس خیال کو متشکل کرنا چاہتے تھے کہ سوادِ جمیل اور لباسِ حریر لازم و ملزوم ہیں وہ مواد کے لحاظ سے بھی الہلال کو ارفع بنانا چاہتے تھے اور مواد کی ترتیب، اس کی طباعت اور اس کے گٹ اپ کے لحاظ سے بھی ۔۔۔۔ اور پھر یہی نہیں علم و ادب، سیاست، مذہب اور ان کے متعلقات کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بھی منفرد تھا جس میں وسعت تو تھی مگر تذبذب نہیں تھا۔ مولانا نے الہلال کا جو فریم بنایا تھا، اس میں ان کے بیشتر یا جو بیشتر معاصرین میں شاید ہی کوئی ڈھل سکتا تھا الہلال میں ضرورت تھی ایسے اہلِ قلم کی جو اردو کے ساتھ ساتھ فارسی، عربی اور انگریزی میں یدِطولیٰ رکھتا ہو۔ پھر ترجمے کے لیے مواد کا انتخاب ایک ایسی منزل تھی جو مولانا کی رہنمائی یا اشارے کے بغیر طے نہیں کی جا سکتی تھی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، دعوتِ الہلال، دارالارشاد، حزب اللہ اور اس طرح کے بہت سے دینی موضوعات تھے جنھیں وہ فرقہ واریت کے سایے سے بھی دور رکھنا چاہتے تھے۔ پھر ندوہ اور مسلم یونیورسٹی کے مسائل تھے جنھیں مولانا اپنی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ اسلامی ممالک کی جدوجہدِ آزادی کو وہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مدغم کر دینا چاہتے تھے اور اس طرح وہ بین الاقوامی پیمانے پر یورپی سامراج کو پامال کرنے کا منصوبہ مرتب کر رہے تھے۔ ان کے نظریۂ جہاد کا اطلاق صرف مسلمانوں پر نہیں ہوتا تھا بلکہ یورپی سامراج کے خلاف جو بھی آواز بلند کرے وہ مجاہد اور احرار کی صف میں آ جاتا تھا۔ عام جدوجہدِ آزادی میں ہی نہیں بلکہ خالص مسلمانوں کی تحریکِ خلافت میں بھی وہ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے تھے اور اس راہ میں وہ جو قدم بھی اٹھاتے اس میں ہندوؤں کا تعاون بھی حاصل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ غرض الہلال کے ادارۂ تحریر میں انھوں نے جن لوگوں کو بھی شامل کیا وہ یا تو مترجم اور ناقل ہو کر رہ گئے یا اگر مولانا کے ساتھ چلے تو چند قدم سے زیادہ نہیں چل سکے۔ مولانا نے الہلال کے کالموں میں کبھی کبھی اچھے ساتھی کی تلاش میں اپنی ناکامی کا رونا رویا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ ایک ایسی جماعت ہو جو نہ صرف یہ کہ ان کے مقاصد اور ان کے لائحہ عمل سے متفق ہو بلکہ ان کے شانہ بشانہ چلنے کی سکت رکھتا ہو اور اس طرح مولانا کا بوجھ ہلکا ہو اور وہ بعض دوسرے امور کی طرف یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو جائیں مگر اصل سوال یہ ہے کہ کیا ایسی جماعت، یا ایسے فرد کا ملنا ممکنات میں تھا۔ اگر کسی شخصیت میں مولانا آزاد جیسے نقوش ہوتے تو وہ خود مولانا آزاد ہو جاتا، اُن کے ادارۂ تحریر یا اُن کے دوسرے پروگراموں میں کیوں شامل ہوتا۔

بہرحال الہلال کے ادارۂ تحریر میں اپنے وقت کے بعض نامور حضرات وقتاً فوقتاً شامل ہوتے رہے خواہ ان کے ربط و وابستگی کی مدت کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو۔ علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، علامہ عبداللہ عمادی، الہلال کے دورِ اوّل میں مولانا کی رفاقت کر رہے تھے علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا عبداللہ کا زمانۂ رفاقت کچھ طویل نہیں تھا، بس یہی کوئی چھ سات مہینے؛ مولانا عبدالسلام ندوی، نسبتاً زیادہ دن ساتھ رہے۔ خواجہ عبدالواحد ندوی بھی الہلال کے قلمی معاونین میں تھے اور اُن کا زمانۂ قیام غالباً سب سے زیادہ تھا۔ خواجہ صاحب مرحوم السنۂ شرقیہ کے بھی عالم تھے اور انگریزی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ الہلال کے کالموں سے بعض اور ناموں کی نشاندہی ہوتی ہے جن کے سپرد ترجمے کا کام کیا جاتا تھا۔ الہلال کے آخری دور میں عبدالرزاق ملیح آبادی صاحب ادارۂ تحریر کے سب سے فعال رکن تھے۔

الہلال کے ادارۂ تحریر کا نام لیتے ہی اس "علمی فتنے" کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو الہلال کے بعض مضامین کی "ملکیت" کے بارے میں رہ رہ کر سر اٹھاتا رہا ہے۔ یہ فتنہ تو دراصل ان غیر ذمہ دار مرتبین اور ناشرین کا زائیدہ ہے جنھوں نے مولانا آزاد کے نام پر جلبِ منفعت کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اور جو مضامین الہلال کے اچھے خراب مجموعے شائع کر کے اپنا کاروبار چمکانے لگے تھے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ الہلال کے مضامین ان کے لکھنے والوں کے نام سے معریٰ ہوتے تھے یہ بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ جو لوگ الہلال کے ادارۂ تحریر سے وابستہ ہو جاتے تھے، ان کی تحریریں ان کے نام کے بغیر شائع ہوتی تھیں۔ خاص طور پر شذرات، مقالۂ افتتاحیہ، افکار و حوادث اور اس نوع کے دوسرے کالموں میں لکھنے والوں کا نام نہیں ظاہر کیا جاتا تھا۔ اور سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایڈیٹر کے رشحاتِ قلم ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ عنوانات ایڈیٹر (مولانا آزاد) کے لیے مخصوص تھے۔ شذرات اور مقالہ افتتاحیہ میں اکثر مولانا ایسی واضح نشانیاں

چھوڑ جاتے تھے کہ اسلوب سے قطع نظر کر لی جائے تو بھی وہ مولانا کی ملکیت کی شہادت دیتے تھے۔ اس کے برعکس جن حضرات کا تعلق ادارتی عملے سے نہیں ہوتا تھا، ان کے مضامین اکثر حالات میں نام کی صراحت کے ساتھ شائع ہوتے تھے۔ مترجمہ مضامین و مقالات وغیرہ میں ترجمہ کرنے والوں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے لیکن اصل مضمون نگار کا نام لکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ الہلال میں خاصا مواد دوسرے اخبارات و رسائل وغیرہ سے ترجمہ کر کے شائع کیا جاتا تھا۔ ایسے مواد کے شروع یا آخر میں واضح کر دیا جاتا تھا کہ یہ اقتباسات یا افادات ہیں۔

کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے الہلال کی پالیسی میں یہ نکتہ بھی شامل کر لیا تھا کہ حتی الامکان ادارۂ تحریر سے وابستہ حضرات کے نام کا اعلان نہ کیا جائے۔ اس زمرے میں خود مولانا آزاد کی ذات بھی آجاتی ہے۔ الہلال میں جو مقالات مولانا کے نام سے شائع ہوئے ہیں تو ان کا شمار مستثنیات یا شواذ میں کرنا چاہیے۔ مولانا آزاد ادارتی عملے کے نام کا اعلان کیوں نہیں کرتے تھے، اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں جن پر اظہارِ خیال کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ایک سبب بہت بدیہی ہے جس کی وضاحت علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں اس طرح کی جا سکتی ہے:

> "ظاہر ہے کہ ہم لوگ جو وہاں شریکِ تحریر و ادارت تھے، کچھ نہ کچھ برجستہ لکھا ہی کرتے تھے اور جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ چھپتا بھی ہوگا لیکن یہ ضرور ہے کہ ہماری تحریروں میں ایڈیٹر صاحب کچھ اصلاح اور کچھ کمی کر دیتے تھے۔ اور اسی لیے ایسی تحریروں کو نہ ہم اپنی پوری کہہ سکتے ہیں نہ ایڈیٹر صاحب اپنی کہہ سکتے ہیں۔" (ہماری زبان علی گڑھ یکم ستمبر ۱۹۶۵ء ص ۸ مکتوب بنام حضرت شاہ فضل امام صاحب واقف آزردی)

فتنہ زائیوں کا مورد وہ مقالہ ہے جو مسجد کانپور کے حادثۂ فاجعہ پر "مشہدِ اکبر" کے عنوان سے ۶ اگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں شائع ہوا تھا۔ اس سوال کو بنیادی اہمیت دی گئی کہ مقالہ مولانا آزاد کا تحریر کردہ ہے یا سید سلیمان ندوی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ چونکہ یہ مقالہ مولانا آزاد کے کسی مجموعۂ مقالات میں شامل کر لیا گیا تھا اس لیے بعض ثقہ حضرات نے صورتِ حال پر اظہارِ خیال کیا اور واضح کیا کہ اس کے مصنف سید صاحب ہیں نہ کہ مولانا آزاد۔ کچھ لوگوں نے حقیقت کی تلاش میں مولانا آزاد سے بھی رجوع کیا اور سید صاحب سے بھی۔ ان بزرگوں نے زبانی یا تحریری جو جوابات دیے ان سے بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ مولانا آزاد نے مشہدِ اکبر کی ملکیت کے باب میں فراخ دلی سے کام نہیں لیا اور جس اظہارِ حق کی توقع ان سے کی جاتی تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ زیرِ بحث مضمون ——— مشہدِ اکبر (قسطِ اول) کی ملکیت سے مولانا آزاد نے اسی زمانے میں انکار کر دیا تھا جب یہ شائع ہوا تھا۔ جب انھوں نے اس مضمون کو اپنے کھاتے میں ڈالا ہی نہیں تھا، تو بار بار تردیدی بیانات کیوں جاری کرتے، یوں بھی اس طرح کے بیانات کی اشاعت مولانا کے مزاج کے خلاف تھی۔ الہلال کے مطالعے سے مولانا آزاد کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور ان کی مذہبی، علمی اور سیاسی شخصیت آئینہ ہو جائے گی۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر جن اہلِ قلم کے خیالات بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ان میں سے اکثر مولانا کے سیاسی موقف کے بارے میں شدید غلط فہمیوں کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ البلاغ تک مولانا کے سیاسی نظریات واضح نہیں تھے۔ ان کے خیالات میں ایک عظیم انقلاب اس وقت رونما ہوا جب وہ رانچی کی نظر بندی سے رہا ہوئے، اور گاندھی جی کے ساتھ تحریکِ خلافت میں فعال ہو گئے۔

دینی خدمات، یورپی استبداد سے نجات کے لیے جد و جہد، کانگریس کی ہم نوائی اور اس ہم نوائی کے ساتھ برادرانِ وطن کے ساتھ اخوت و تعاون کا سلوک، مسلم لیگ کے نظریات و طریقۂ کار کی مخالفت اور مسلمانوں کی "چل سالہ قومی پالیسی" کے خلاف شدید احتجاج ——— یہ تھے مولانا کی زندگی کے جادیات و اولیات جن کا عکس الہلال کے کالموں میں ملتا ہے۔ الہلال کے مطالعے کے بعد ہمیں اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگتی کہ مذکورۂ بالا عنوانات پر مولانا کے موقف میں نہ تو کبھی تزلزل آیا اور نہ کبھی اس پر نظرِ ثانی کی ضرورت انھوں نے محسوس کی۔ لوگ ان کے جس موقف کی ابتدا کا زمانہ ۱۹۲۰ء کو قرار دیتے ہیں، اس کا حرفِ آغاز انھوں نے ۱۹۱۲ء میں لکھ دیا تھا!

مولانا آزاد نے اردو نثر کو جو اسلوبی تنوع دیا، اس کی مثال کسی اور ادیب کے یہاں نہیں ملتی۔ ایسے ہی فنکاروں کے لیے یہ جملہ وضع کیا گیا تھا کہ وہ اپنے اسلوب کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی لیکن مولانا کے اسلوب پر یہ نیاز مندانہ مگر فرسودہ جملہ اس کی ہمہ گیری کی نمائندگی نہیں کرتا۔ یہ ایسا جملہ ہے جس کا اطلاق ہر جدت پسند طبیعت پر کیا جاتا رہا ہے۔ مولانا کے اسلوب کو جب تنقید کے کسی معروف اور متداول چوکھٹے میں بٹھایا جائے گا تو یا تو اسلوب اس میں گھٹن محسوس کرے گا یا وہ چوکھٹا اپنی ہیئت کذائی سے دست بردار ہو جائے گا۔

اسلوب کی تشکیل طبائع سے بھی ہوتی ہے اور اندازِ نظر سے بھی۔ جب طبائع کی رگ و پے میں اندازِ نظر خون بن کر دوڑنے لگتا ہے اور پھر یہ خون آنکھ سے ٹپکنے لگتا ہے تو ان کے اسلوب کے اثر و نفوذ کی گیرائی و گہرائی کو تولنا اور ناپنا آسان نہیں ہوتا۔ مولانا وہ بار اٹھا لائے تھے جس نے سب پر گرانی کی تھی۔ انھوں نے دنیا کو ایک پُرامن معاشرے کی شکل میں دیکھنا چاہا تھا۔ جہاں نہ کسی کا استحصال ہو اور نہ کسی پر استبداد۔ دیدار کی یہ آرزو مبنی تھی ان تعلیمات پر جو انھوں نے اپنے مذہب سے اخذ کی تھی۔ آرزو دیدار نے انھیں لذتِ آزار سے آشنا کر دیا تھا۔ یہی لذتِ آزار ہر آزمائش پر پوری اتری ——— وہ کام و دہن کی آزمائش ہو یا دار و رسن کی۔ یہی لذتِ آزار ان کے اسلوب کا سرچشمہ تھا۔ ان کی طبیعت میں رومانیت تھی مگر وہ رومانیت نہیں جو سرابوں کے تعاقب میں گم ہو جاتی ہے۔ ان کی رومانیت کبھی پاسبانِ عقل کے شانہ بشانہ چلتی تھی اور کبھی اس کیفیے سے کسبِ نور بھی کر لیتی تھی جسے انھوں نے ۱۹۱۲ء میں مرتب کر لیا تھا۔ اور جسے کبھی وہ مشعلِ راہ سمجھتے تھے اور کبھی زادِ راہ۔ جو سفر سے پہلے منزل کا تعین کر لیتا ہے اور جو راستے کی ناہمواریوں اور ان ناہمواریوں کے نتیجے میں آبلہ پائیوں کا احساس کر لیتا ہے، اس کا سفر نفسِ چند کی راحت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ مولانا اس سفر پر تنہا روانہ ہوئے تھے مگر وہ اپنے ساتھ ساری دنیا کو لے جانا چاہتے تھے۔ ان کی اسی خواہش نے ان کے اسلوب کو کبھی حُدی خوانی سکھائی، کبھی اسے رجز کا دبدبہ دے دیا، کبھی اسے آوازِ جرس عطا کی اور کبھی اسے صاعقہ بر دوش کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہم سفروں کا دل رکھنے کے لیے کبھی اسے نرمی اور لطافت بھی بخشی۔

مولانا آزاد بڑے معروف و مقبول خطیب تھے۔ ان کی بہت سی تقریریں جب حیطۂ تحریر میں آئیں تو وہ نثری اسلوب کا مرقع ثابت ہوئیں۔ ان کے طرزِ نگارش میں بھی خطابت کے عناصر شامل ہیں مگر ان کی خطابت حریری اور ہمدانی کی خطابت نہیں ہے جو دورانِ مطالعہ قاری کو مسحور کر دیتی ہے مگر اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا۔ مولانا کا طرزِ خطابت سحر آفریں بھی ہے اور موثر و دیرپا بھی۔ وہ مطالعے کے وقت دل و دماغ میں نفوذ کرتا ہے اور اس کے بعد اعضا و جوارح میں بڑی شدت کے ساتھ جاری و ساری ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت مدتوں قائم رہتی ہے۔ مولانا کا اندازِ خطابت نہ تو واعظانہ ہے اور نہ ناصحانہ۔ وہ قرآن و حدیث سے استدلال کرتے ہیں مگر یہ استدلال عالمانہ ہوتا ہے اور نشترِ اس میں سے داعیوں کی لاگ نہیں رہتی۔ اُن کی خطابت رومانیت کے زیرِ سایہ پروان چڑھتی ہے جو کبھی انانیت کا روپ دھار لیتی ہے اور کبھی زجر و توبیخ کا۔ یہ کبھی فردوسِ گم شدہ کی تلاش میں نکلتی ہے اور کبھی ابنائے وقت کی شکوہ سنجیوں کے قالب میں ڈھل جاتی ہے مگر ہر موقع پر وہ مولانا کے قبضۂ قدرت میں رہتی ہے۔ وہ رومانیت کو بھول بھلیاں میں بھٹکنے نہیں دیتے۔ وہ جب اسے آزاد چھوڑ دیتے ہیں اس وقت بھی اس کی ڈور ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

یہ مقامِ حیرت بھی ہے اور اس کے ساتھ ایک زندہ حقیقت بھی کہ مولانا نے ۲۴ سال کی عمر میں الہلال کا اجرا کیا اور اس میں جس اسلوبِ نگارش کی انھوں نے طرح ڈالی، وہی ان کا طرۂ امتیاز ثابت ہوا۔ فکری پختگی اور اسلوبی بلوغ کی ایسی مثالیں خال خال ملیں گی۔ یوں بھی مولانا کی شخصیت کا شمار مستثنیات میں ہوتا ہے۔ مستثنیات کے بارے میں کسی بھی طرزِ استدلال کو مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ مولانا نے قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ کیا تھا ـــــ اتنا عمیق مطالعہ کہ ترجمان القرآن جیسی تفسیر انھوں نے لکھی۔ انھوں نے عربی ادبیات کو پانی کر کے رکھ دیا تھا۔ عربی الفاظ، عربی تراکیب اور عربی جملے ان کے وردِ زبان تھے، فارسی میں بھی وہ یدِ طولیٰ رکھتے تھے، اس لیے ان کی زبان میں عربی و فارسی کا در آنا بڑی فطری بات ہے۔ اسے عیب کہیے یا ہنر کہ جب روح کے اندر خیالات متلاطم ہوتے ہیں تو گفتار کے اسلوب کو قابو میں رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مولانا نے اپنے نظامِ حیات کا جو کلیہ مرتب کیا تھا، اس کا ماخذ عربی زبان کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اس لیے قدم قدم پر انھیں اپنے ماخذ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ مگر یہ حال تو بہت سے اردو دانوں کا تھا۔ سرسید سے لے کر شبلی تک کس نے عربی زبان کو اپنا محور نہیں بنایا مگر عربی اور فارسی کے بے پناہ تسلط کے باوصف مولانا آزاد کے اسلوب نے اصغر گونڈوی کے اس قول ـــــ ' جو حسن ہے بتوں میں جو مستی شراب میں ' کی جو ترجمانی کی ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔

بلاغت کی تعریف اور اس کی توضیح و تشریح میں علمائے فن صدیوں سے خونِ جگر صرف کر رہے ہیں، اس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر مبسوط کتابیں نہ لکھی گئی ہوں۔ اکثر علما نے بلاغت کی جزئیات کی مثالیں کلامِ پاک سے مستنبط کی ہیں۔ یہ ساری کتابیں مولانا آزاد کے زیرِ مطالعہ رہ چکی تھیں۔ اس لیے فنِ بلاغت پر انھیں ماہرانہ عبور حاصل تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ الفاظ کے خزانے سے مقتضائے حال کے مطابق کس لفظ کا انتخاب انسب ہوگا۔ مولانا کی زبان پر ایسے الفاظ چڑھے ہوئے تھے جن کا اردو میں استعمال عام نہیں تھا مگر مولانا کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غیر متداول الفاظ کو مقتضائے حال کا ترجمان بنا دیا۔

مجھے اس کا یقین ہے کہ مولانا آزاد نے مغربی ادبیات کا بھی عمیق مطالعہ کیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں انگریزی کی تحریر و تقریر پر قدرت حاصل نہیں تھی۔ لیکن وہ اس کے الفاظ و تراکیب کی معنویت اور ان کے برمحل استعمال سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ انگریزی طرزِ فصاحت کے بھی رمز شناس تھے۔ مغربی ادبیات کے مطالعے سے اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم انھیں ان سوالات کا جواب ضرور مل گیا کہ مقصدیت میں وسعتِ نظر کو کس حد تک شامل کر لینا چاہیے اور اندازِ کلام میں شگفتگی اور برجستگی کس عنوان سے مدغم کی جا سکتی ہے۔ یہی نہیں عرب ممالک سے شائع ہونے والے اخبارات اور جرائد بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔ یہ اخبارات و جرائد مغربی صحافت سے کسبِ فیض کیا کرتے تھے، مولانا کے اسلوب میں شکوہِ الفاظ و تراکیب کے باوجود جو شگفتگی آئی ہے، وہ اگر ایک طرف قرآن و حدیث کے اسالیب کی دین ہے، تو دوسری طرف مغربی لٹریچر اور عربی جرائد کا فیضان بھی۔ مولانا نے کسی کے اسلوب کی تقلید نہیں کی اور اسلوب کی تقلید کون کر ہی سکتا ہے۔ دراصل ان کی ادبی شخصیت کے عہدِ تشکیل میں مندرجہ بالا عناصر نے غیر شعوری طور پر اپنا کردار ادا کیا اور جب مولانا نے الہلال میں لکھنا شروع کیا تو ان کا عہدِ تشکیل ختم ہو چکا تھا۔ اور وہ ایک صاحبِ طرز انشا پرداز بن چکے تھے۔ صرف و نحو اور قواعد کی جزئیات کے تفاوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا آزاد کے ایسے جملوں کی تعداد کم نہیں ہے جن کا اگر انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو وہ انگریزی کے کسی صاحبِ طرز کے رشحاتِ قلم معلوم ہوں گے۔

افادہ و استفادہ کی راہیں بڑی عجیب ہوتی ہیں۔ ہر فرد کا طرزِ افادہ الگ ہوتا ہے اسی طرح ہر فرد کا اندازِ استفادہ بھی منفرد ہوتا ہے۔ غالب کے خطوط کے باب میں یہ جو مراسلے کو مکالمہ بنا دینے کی بات کہی جاتی ہے تو یہ صرف ان کے اردو خطوط تک محدود نہیں ہے۔ اردو میں مکتوب نگاری کے آغاز سے بہت پہلے انھوں نے اپنی فارسی خطوط میں علانیہ اپنی اس خصوصیت کا اظہار کیا ہے ـــــ اور فارسی کے یہ خطوط اس وقت لکھے گئے تھے جب مغربیت کے مطالعے و مشاہدے کا انھیں موقع مل چکا تھا۔ میں نے ایک بار غالب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ جو غالب کی شخصیت اور ان کے فکر و فن میں ایک نیا پن ملتا ہے، ممکن ہے وہ مغرب کے زیریں تموج کی دین ہو۔ اسی طرح مولانا آزاد کے ٹھوس مشرقی اسلوب میں مغربیت کے زیریں تموج کا وجود خارج از امکان نہیں۔

کسی کے اسلوبِ نگارش میں ارتقا کا انکار ممکن نہیں لیکن ارتقا کی مختلف شکلیں ہمارے سامنے ہیں۔ کبھی ارتقا خوب سے خوب تر کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی ارتقا منہاج و مبادی کی صورت ہی بدل دیتا ہے اور کبھی کبھی تو یہ ارتقا ترقیٔ معکوس کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں اور شاید سچ کہتے ہیں کہ غبارِ خاطر میں مولانا آزاد کا اسلوب اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا ہے یعنی ان کا ارتقا خوب سے خوب تر کی منزل کا طغرۂ گوش ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس طرح امتدادِ زمانہ کے باوصف مولانا کے فکری موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، اسی طرح ان کے اسلوب کے مبادیات الہلال سے غبارِ خاطر تک کسی تغیر سے دوچار نہیں ہوئے۔ جو کچھ تبدیلی ہے وہ موضوع کی تبدیلی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ غبارِ خاطر خطوط کا مجموعہ ہو یا انشائیوں کا، بہرحال اس کے مباحث مولانا کی دوسری مطبوعات کے مباحث سے میل نہیں کھاتے۔ یہ تو ادبیات کا مسلّمہ اصول ہے کہ مباحث و موضوعات کا تفاوت کبھی اسالیب پر حاوی ہو جاتا ہے اور کبھی اسالیب مباحث و موضوعات

کو زیر کر دیتے ہیں۔ مولانا کے یہاں یہ دونوں محرکات کارفرما ہیں مگر یہ فعال اور سرگرم نہیں۔ تبدیلی کے قرائن ملتے ہیں، تبدیلی بذات خود موجود نہیں۔

مولانا کے اسلوب کو تین موٹے موٹے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہی بات اس طرح بھی کہی جا سکتی ہے کہ ان کے اسلوب کی تین شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یہ شکلیں منفرد و ممتاز ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے کسب نور کرتی رہتی ہیں مگر اس عمل سے جو غازہ نور تیار ہوتا ہے وہ اتنا لطیف ہوتا ہے کہ اس کی تہہ نہ تو چہرے کے خط و خال کو متاثر کرتی ہیں اور نہ اس کی انفرادیت کو مجہول بناتی ہیں۔

مولانا کا ایک اسلوب تو وہ ہے جو کاروباری رقعات و مکاتیب اور فوری ضرورت کے تحت لکھی جانے والی تحریروں میں ملتا ہے مجموعی طور پر یہ اسلوب مولانا کے تشخص کی نشاندہی نہیں کرتا۔ اگر کہیں ایک آدھ فقرے چونکا دینے والے مل جاتے ہیں تو ان کا شمار مستثنیات میں کرنا چاہیے۔ ان کا شمار مولانا کے ان اسالیب میں نہیں کرنا چاہیے جو تین خانوں میں سے کسی ایک میں جگہ پاتے ہیں۔

مولانا کا ایک اسلوب تو وہ ہے جو خطیبانہ جلال اور پیمبرانہ شکوہ سے عبارت ہے ہفت افلاک ان کے زیر نگیں رہتے ہیں اور وہ جس مقام کو چاہتے ہیں، اسے اپنا منبر بنا لیتے ہیں۔ کبھی آسمان کی بلندیاں ان کا مسکن نظر آتی ہیں، کبھی تخت و افسر کو وہ بازیچۂ اطفال سمجھتے ہیں، کبھی وہ قطب مینار کی سیڑھیاں طے کرتے جاتے ہیں اور ان کا مخاطب ان کی آواز کو بانگ جرس سمجھ لیتا ہے اور وہ ہمہ تن جوش اور مجسم انقلاب بن جاتا ہے، اس کے شکستہ بال و پر میں توانائی آجاتی ہے۔ مولانا کے خطیبانہ اسلوب میں انانیت کا جو قوح ہے وہ زمانے کو ہلا کر رکھ دیتا ہے مگر یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا کی انانیت۔ تو احساس کمتری کی زائیدہ ہے اور نہ دنیا کا مذاق اڑانے کا ایک آلہ انھیں اس کا یقین تھا کہ وہ جو کچھ سوچتے ہیں، وہی سچ ہے اور مصلحتوں نے دوسرے قائدین قوم کو زیر دام کر رکھا ہے۔ سچائی کی منزل ان کے سامنے رہتی ہے، انھیں ڈر رہتا ہے کہ مبادا یہ منزل نگاہوں سے اوجھل ہو جائے، اس لیے وہ اس منزل کی طرف تنہا چل پڑتے ہیں۔ قوم کی واماندگی مولانا کی گرمیٔ رفتار میں اور بھی شدت پیدا کر دیتی ہے، اسی گرمیٔ رفتار کو ان کی انانیت کا ایک اظہار سمجھیے۔

اسی خطیبانہ اسلوب کی وجہ سے الہلال کی دعوت کو قبول عام ملا اور ۱۹۱۲ء کے بعد مسلم قیادت میں تبدیلی کے جو آثار نمایاں ہوئے، وہ بلا شبہ الہلال کی دین ہے۔ یوں تو موجودہ صدی کی ابتدا سے ہی مسلمان دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ اپنے لائحہ عمل پر نظر ثانی کے لیے پر تول رہا تھا۔ مگر اسے نہ تو کوئی تحریک میسر تھی اور نہ اسے کوئی ایسا قائد ملا تھا جو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کا سلیقہ سکھاتا۔ فکر ان طبقے نے دانشوروں کی اس اضطراری کیفیت کو محسوس کر لیا تھا اور انھوں نے پرانے قائدوں کی مدد سے تقسیم بنگال اور پھر اس کی تنسیخ کا ڈراما رچایا لیکن اس ڈرامے کا ردعمل مزید اضطراب و انتشار کا باعث ثابت ہوا۔ مولانا آزاد اس وقت بہت کم عمر تھے لیکن ان کی نگاہ سے مرض کی تشخیص میں چوک نہیں ہوئی۔ انھوں نے الہلال نکالا جو کسی تبلیغ یا جبر کے بغیر عوام کا ترجمان بن گیا۔

خطیبانہ اسلوب اکثر شعلۂ مستعجل ثابت ہوتا ہے، یہ اسلوب وقتی اور ہنگامی جذبات کا پروردہ ہوتا ہے اس لیے وقت کے کروٹ بدلتے ہی اس کی گرفت ختم ہو جاتی ہے لیکن اگر جذبات افکار کے سانچے میں ڈھل کر ظاہر ہوتے ہیں تو اس کی گرمی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ مولانا کا خطیبانہ اسلوب جذبات سے زیادہ افکار کا رہین منت ہے اسی لیے آج بھی اس کا مطالعہ ہمارے سوز دروں کی آئینہ داری کرتا نظر آتا ہے۔

مولانا کے دوسرے اسلوب کو ہم فلسفیانہ یا عالمانہ اسلوب کے نام سے یاد کر سکتے ہیں۔ ترجمان القرآن، تذکرہ اور الہلال کے ۔۔۔ التفسیر وغیرہ اس اسلوب کے مختلف مظاہر ہیں۔ کلام پاک اور احادیث سے استدلال کرتے ہوئے الفاظ کے انتخاب اور جملوں کی ساخت میں بے حد محتاط رہنا پڑتا ہے۔ دینی اور علمی مسائل میں دین اور علم کا سیاق و سباق نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسماء الرجال، علم الکلام اور دین سے متعلق بعض اور علوم کی مصطلحات جنھیں بڑی تعداد میں ورتتے میں ملی ہیں، ان مصطلحات سے انحراف نہیں کیا جا سکتا۔ پھر مولانا قدیم اور جدید کے مابین تطبیق بھی کرتے جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وضع اصطلاحات کی بعض نئی منزلوں سے بھی انھیں گزرنا پڑتا ہے اور اس طرح ان کا اسلوب عام نگاہوں میں ثقیل اور ماوراے فہم بن جاتا ہے مگر مولانا کو تفسیر اور دوسرے علوم میں کہیں نہ کہیں اتنی چھوٹ مل جاتی ہے کہ وہ جس سطح سے بھی چاہیں بات کریں، ان پر علم اور دین کی احتیاطوں سے انحراف کا الزام عائد نہیں ہو سکتا۔ مولانا اس چھوٹ سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان کا جو بنیادی اسلوب ہے اس میں گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ الہلال، تذکرہ اور ترجمان القرآن میں بہت سے علمی اور دینی مباحث ایسے ہیں جہاں مولانا کو اپنے فطری اور بنیادی اسلوب کے مظاہرے کا موقع مل گیا ہے۔

مولانا کا تیسرا اسلوب وہ ہے جسے میں ان کا بنیادی اسلوب کہتا ہوں۔ اس بنیادی اسلوب کا دوسرا نام "غبار خاطر" ہے۔ غبار خاطر کی اہمیت اس لیے نہیں ہے کہ اس میں مکاتیب کو ایک نئے قالب میں ڈھالا گیا ہے یا یہ کہ اس کے ذریعہ جدید مگر فکر انگیز مباحث کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں مولانا کی کچھ سوانحی جھلکیاں ہیں، ان کے بعض معمولات کا ذکر ہے، بعض علمی مباحث پر سرسری تبصرے ہیں یا پھر کہیں کہیں اس میں ایسی راہوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو ہمیں مولانا کے دل تک پہونچا دیتی ہیں۔ اور جن چیزوں کو وہ پردۂ خفا میں رکھنے کے عادی ہو گئے ہیں، اگر ہم انھیں چھو اور کرید نہیں سکتے تو کم از کم دیکھ تو سکتے ہی ہیں۔ شوق نے بند نقاب حسن تو وا کر دیتے ہیں، اب اس کا پتا کون لگائے کہ خود نگاہ حائل نظارہ ہے یا نہیں!

مولانا کی شخصیت میں فکر بھی ہے اور جذباتیت بھی لیکن جب یہ دونوں عناصر ان کے بنیادی اسلوب میں ڈھلتے ہیں تو فکر نہ تو الفاظ کے طلسم میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور نہ جذباتیت ہیجان اور تشنج کا شکار ہوتی ہے انفعالیت سے کبھی مولانا نے رشتہ نہیں جوڑا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی فعالیت صاعقہ بردوش ہے۔ وہ زیر لب تبسم کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں اور اپنی فکر کو آہستہ خرامی سکھا دیتے ہیں سمندروں کے سکوت سے بھی ترنم پیدا ہوتا ہے۔ ان کا بنیادی اسلوب اسی ترنم کا حامل ہے۔ ان کے میکدۂ فکر میں اگر کوئی قطرۂ تلخ بھی ہے تو وہ اسے بھی شیشۂ غزل میں ڈھال کر متغزلانہ کیفیت سے آشنا کر دیتے ہیں۔

انانیتی اسلوب میں مولانا اپنے سامع یا قاری سے اتنے دور چلے جاتے ہیں کہ اس کے سامعہ تک ان کی آواز یا تو صدائے بازگشت کی صورت میں پہونچتی ہے یا بانگ رحیل کی شکل میں

فلسفیانہ اسلوب میں مولانا آزاد اپنے قاری سے رشتہ استوار رکھنا چاہتے ہیں، جب وہ ایک دلیل سے ہموار نہیں ہوتا تو اس کے سامنے دوسری دلیل پیش کر دیتے ہیں۔ وہ اگر راہِ فرار اختیار کرنا چاہتا ہے تو دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں اور اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کو صحیح کہے۔

بنیادی اسلوب میں ان کا قاری ان کا ہمدم و ہمراز نظر آتا ہے وہ دوئی کی حدیں توڑ دیتے ہیں اور اسے زیادہ سے زیادہ اپنے قریب لے آتے ہیں۔ عالمانہ وقار کے ساتھ وہ بے تکلفی کی ہر منزل سے گذرتے ہیں کبھی سرگوشیاں کرتے ہیں، کبھی اپنے داغہائے سینہ پر ماتم کرتے ہیں اور کبھی زمانے کی بوالعجبیوں کا مذاق اڑاتے ہیں ان کا یہ اسلوب غزلیت کا پروردہ ہے اور "سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ" کا ترجمان، یہی وہ منزل ہے جہاں وہ خواب کو حقیقت اور حقیقت کو خواب بنا دیتے ہیں۔ ان کے اس اسلوب میں غزلیت اور نسائیت کا متوازن امتزاج ملتا ہے۔ مولانا کا بنیادی اسلوب یہی ہے اور غبارِ خاطر اسی اسلوب کی ترجمانی کرتی ہے ——— اور میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مولانا آزاد کا جو اسلوب غبارِ خاطر پر ختم ہوا، الہلال میں اس کی شاندار ابتدا ہو چکی تھی، فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اسلوب پوری غبارِ خاطر کو محیط ہے اور الہلال میں اس کے منتشر اجزا ملتے ہیں۔ مولانا کو مقتضائے حال کے مطابق اگر دوسرے اسالیب کی ضرورت نہ پیش آتی تو وہ غبارِ خاطر کے اسلوب میں سارا الہلال نکال سکتے تھے۔ ایک بار الہلال میں انھوں نے لکھا تھا:

" یکو حصہ پیسے عالم ادب و شعر کے ہم خود بھی رہ نوردِ رہے تھے اور الہلال کی اشاعت کے وقت ارادہ تھا کہ خالص ادبی و شعری افکار و مقالات کا بھی اس میں خاص حصہ ہوگا لیکن آگے چل کر معلوم ہوا کہ یہاں ایک کے ہو رہنے کے سوا چارہ نہیں، اور اس عالمِ حدماتِ حسن و عشق سے الگ ہو کر صرف اصلاح و مذہب ہی پر قناعت کرنی پڑی شاید ہم اب بھی اس کام کو کر سکتے ہیں مگر نہیں کرتے

دمد ہزار شیوہ و طاعت حق گراں نبود لیکن صنم بسجدہ درِ ناصیہ مشترک نخواست " (الہلال جلد ۵ شمارہ ۳)

مولانا آزاد نے مندرجہ بالا عبارت میں اپنے جس شغف اور جس صلاحیت کی نشاندہی کی ہے، اس پر کبھی زوال نہیں آیا اور اس کے دلکش نقوش ان کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں نمایاں ہو جاتے ہیں غبارِ خاطر انھیں نقوش کا مجموعہ ہے۔ مثالوں کے ذریعہ اس اجمال کی تفصیل گستری اس مختصر مقالے میں مناسب نہیں معلوم ہوتی لیکن ثبوت میں چند اقتباسات نقل کر دینا بھی نامناسب نہیں ہے الہلال کی مختلف اشاعتوں کے بعض اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

" قسمت ما ہر کسے اندازۂ ہمت ہے از ل ـــــ

قسامِ ازل نے ہر شخص کو اس کی ہمت اور صلاحیت کے مطابق اس کا حصہ دے دیا ہے کوئی سایۂ طوبیٰ میں بیٹھ کر خوش ہوتا ہے اور کوئی قامتِ یار کی حسرت میں

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار

خوشی کے دن نہیں نصیب نہیں کہ یاد رکھیں تو ایسے ایام غم کو تو نہیں بھول سکتے؟ اوروں کو اگر فصلِ بہار مل ہے تو مبارک ہو ہم خزاں کی یادگار منایا کریں گے

لذتِ غم ہی سہی، نعمتِ شادی نہ سہی

اگر دل پھرنے والے ہیں تو عجب نہیں کہ وہ غم سے محبت کی لے پیدا ہو جائے بہار خزاں کے بعد ہی آتی ہے اور خشک درختوں کو ہم نے سرسبز ہوتے دیکھا ہے "

(الہلال جلد ۱ شمارہ ۷)

" اپنی حالت کیا عرض کروں۔ وہی پرانا جادۂ حسرت ہے اور وہی پرانی بھولوں کی تلاش

مثالِ ماست دریا و صالِ مستغنی است دہد شوق و دے رخصت نظارہ نہ دہد

یہ دائم المرضی نہیں ہے کہ قدرت کی طرف سے تازیانۂ تنبیہ و عبرت ہے مگر افسوس کہ دل کی غفلت نہ گئی اس سے بھی زیادہ سخت چابکوں کو ڈھونڈتی ہے خدا کی شکر ہے کہ اس کی رحمت کی طرح دور میرے سر پر یہ چمکتا ہے اور اس کے دل دریب چاند کی ٹھنڈی روشنی کبھی لو سے کم نہیں کرتی۔ اس کا ابر رحمت جب برستا ہے تو تباہی محل والوں کی طرح میرے محل خانہ کے پرنالے بھی بہتے ہیں پھر اس کے سوا جو کچھ ہے، اسے خود اپنی محرومی اور بے عملی کیوں نہ کہوں " (الہلال جلد ۱ شمارہ ۳)

" اس ایک ہی آسمان کے نیچے ایک ہی وقت میں کیسے کیسے مختلف اور متضاد تماشے ہوتے ہیں، اگر ہماری طرح آسمان بھی دیکھتا ہوگا تو اس کے سامنے کیسے عجیب اور مدہش منظر ہوں گے ایک گوشے میں نشاط و شادمانی کا ہنگامہ برپا ہے، دوسری طرف حسرت و نامرادی کے ماتم سے دنیا کو فرصت نہیں بہت ممکن ہے کہ جس وقت دنیا کے ایک حصے میں پھولوں کی سیج پر خواب وصل کے لذت یاب کروٹیں بدل رہے ہوں، ٹھیک اسی وقت کسی دوسرے حصے میں گرم بالوں اور نیزہ کاشوں پر وں بچاں لاشیں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو رہی ہوں، لیکن لذت پرستی کے پرستاروں کو قتیلانِ حسرت و یاس کا افسانہ سننے کی مہلت کہاں، اگر غم کے ماتم کدوں میں آگ لگ گئی ہے تو عیش کے عشرت کدوں میں گلاب کا چھڑکاؤ کیوں روک دیا جائے؟ دنیا کے کارخانے ہمیشہ غفلت کی کل سے چلے ہیں اور چلتے رہیں گے۔

دغا دعا رحمت دل ترا چہ حسرت کرگل بچیب مگر دو قبائے تنگ ترا " (الہلال جلد ۱ شمارہ ۷)

" عالمِ حدمات و حیات کے صدہا مطالب ہیں جنھیں ہزار ہا صحفوں پر پھیلا کر لکھیے جب بھی ختم نہیں ہو سکتے لیکن اگر ایک سینہ داغ گویا، ایک چشمِ سحر، ایک نگہِ ناطق، ایک طرۂ معنی طراز ایک خالِ فکر اندیش، سامنے آجائے تو ان کے درس و فہم کے لیے ایک لمحۂ نظارہ ہی کافی ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی کم

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی ہر صاحبِ حال ضرور تصدیق کرے گا

درحقیقت اگر شرحِ دنیا کے واردات و اثرات کا علم مرتب کرتا اور دس ضخیم جلدیں لکھ جاتا جب بھی آپ کچھ نہ سمجھتے لیکن کسی کے چہرۂ محبوب نگہ سرمگیں کا ایک نظارہ آپ کو سب کچھ دکھا دیتا ہے اور حقائق حسن و عشق کے وہ وہ اسرار و غوامض خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو دنیا بھر کے حکیموں اور فلسفیوں کی رہائیں بھی حل نہیں کر سکتی تھیں؛

آپ کے رویے علم اشرق کا رستہ رکا ہوا ہے جس نے کسی وسیع علمی عمارت کے اندر بڑی بڑی کتابیں اور بڑے بڑے آلات دیکھے ہوں، لیکن میری نظر میں اس کی حقیقت اس جوش عصبیت کے ڈھیر کو کوئی نہیں جانتا جسے کسی حال آتشیں کی انگیائی جلوہ تابی کے نظارہ کا بار بار موقع ملا ہے، اور ہمیشہ اس کے خرمن صبر و شکیب پر بجلیاں گرتی رہی ہیں

دام تا بہ برق منتہ جوابد ریحت بر ہوشم — قصور کردہ ام گستاخی بہ نقاشی را " (الہلال جلد ۵ شمارہ ۱۳)

" میں نے بہت چاہا کہ اپنے زخموں کو چھپاؤں لیکن نہ چھپا سکا۔ ایک مدت کے سکون اندمال کے بعد آج پھر ایک لحظہ اضطراب و کاوش میسر آگیا ہے۔ میرے دل کی بے چینیوں نے مجھے بستر راحت سے برتہ و بالا کر دیا، اور میرے زخم ہائے کہنہ کے ٹانکے بے اختیار کھل گئے۔ اب ان کی خونفشانی نہیں رک سکتی

آمادہ گشتہ ایم دگر امشب بہ نظارہ ما — بیمار کردہ ام جگر پارہ پارہ ما

آج میں پھر اپنی وہی متاع کہنہ لے کر بازار مقصود میں نکلا ہوں جو ہمیشہ سے میرے کاروبار آہ و نالہ و التماس و ابتہال رہی ہے، اور جس کے سوا میرے جیب و آستین حسرت میں اور کچھ نہیں؟ میرے پاس ایک زخمی دل کے چند ٹکڑے ہیں جن سے خون تمنا کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ میں خریداروں کا متلاشی ہوں۔ کوئی ہے جو ان پارہ ہائے خونیں کا طلبگار ہو؟

روئے باز آر مراد امروز عرض ما ست — دامن تو مپیر و تم دیدۂ تر می خسپم " (الہلال جلد ۵ شمارہ ۱۶-۱۷)

" مارم مریب صبح کہ جانب رکوئے دوست — ناکام رفت و خاطر امیدوار بود

بالآخر وہ ڈیپوٹیشن جس کا تذکرہ بعض اخبارات میں شروع ہو گیا تھا، ۲۵ مارچ کی سہ پہر کو ہز ایکسیلنسی لارڈ ہارڈنگ کے سامنے پیش ہوا

جوش کی دید کو جاتا ہوں ذرا میں قائم — مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا کرے

ایک مفصل ایڈریس کے ذریعہ مسلمانوں کی امن پسندی اور وفاداری کے میثاق قدیم کی زبان معترف اور سر اطاعت کے ساتھ تجدید کی گئی

یقین عشق کی دار پر گماں ترجیہ!

ایڈریس میں اس کے سوا اور کچھ نہ تھا اور جو بات کہنی نہیں چاہیے تھا

حرم سعدہ ہائے دگر از کسی نہ دیدم — جائے کہ نقش قدم او اثرے داشت!

ایک واقعی بات کے دہرا دینے میں چنداں حرج نہیں، اور ارباب محبت جانتے ہیں کہ کسی کے لب جاں بخش سے اگر ایک بار بھی جواب پھر ملنے کی امید ہو تو سودائیان عشق کو ہزار مرتبہ پکارنے سے بھی انکار نہیں ہوتا

گو وہ سنتے نہیں پر ہم تو کسی حیلے سے — ایک دو بات محبت کی سنا آتے ہیں

سوال غیر کے جواب میں جتنی مرتبہ نگاہ مہر کا نظارہ حاصل ہو جائے عشق کا اندوختہ اور امیدوں کا خزانہ ہے

یاں غیر سے نیاز ہے واں اپنی دل ربی — حکم کا رہا گلہ سے منت تلک!

تاہم موقع پر کوئی دل پسند شعر یاد آ جائے تو حیات ذوق سے باز نہیں رہ سکتا۔ مولانا اسمٰعیل مرحوم عربی کے ادیب تھے، اردو کے شاعر تھے، تاہم کبھی کبھی اچھے شعر بھی کہہ جاتے تھے۔ ایک ان کا بڑا معاملہ شعر نہیں بھولتا

پہلے ہی اپنی کون سی تھی قدر و منزلت — برت کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی!

ڈیپوٹیشن کی طویل فہرست ہم نے کسی دوسری جگہ انگریزی معاصر دہلی سے نقل کر دی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت وسیع مجمع تھا۔ اور تقریباً ہر صوبے اور ہر طبقے کے اشخاص شامل تھے اگرچہ

سرشتہ در کف ارنی گوئے طور بود!

خاص اعتبار کی بات یہ ہے کہ اس مجمع میں ہر طرح کی خوشبوئیں شامل تھیں۔ پیران کہن سال بھی تھے اور جوانان جدید بھی۔ خرقہ زہد بھی تھا اور قبائے رندی بھی۔ سرہائے سجود بیتہ بھی تھے اور نگاہ ہائے عشوہ طراز بھی۔ پہلے کے لیے عذر کی ضرورت نہیں۔ دوسرے سے اگر سوال و جواب کی ضرورت ہو تو شیخی آزردہ مرحوم کی زبانی جواب پہلے سے سن لیجیے

میں اور بزم بادہ کشی، لے گئی مجھے — یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں " (الہلال جلد ۳ شمارہ ۱۲)

" گو وقت گزر چکا ہے مگر اصل یہ ہے کہ عیش و نشاط کی محفلوں کے لیے وقت کی قید ہوتی ہے، ماتم و فغاں کا کوئی وقت خاص نہیں۔ نہیں جب قدرت کی بخشش حیات میں سے ابھی ایک عمر باقی رہ گئی ہے تو خاص وقتوں کی کیا قید؟ جب مہلت ملے، بہتر ہے کہ اس میں مشغول ہو جائیں، بلکہ جلانے والوں کی غفلت سے اگر آگ بجھنے لگے تو خود دامن سے ہوا دے کر اور روشن کر دیں

دلا یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے، کہ آخر — نہ نالۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے! (الہلال جلد ۳، شمارہ ۱۱)

مندرجہ بالا اقتباسات صرف اس حقیقت کے اظہار کے لیے نقل کیے گئے ہیں کہ مولانا آزاد کا جو بنیادی اسلوب ان کی پہچان بن گیا ہے، اس کا بھرپور مظاہرہ الہلال میں ہو چکا تھا۔ الہلال کو مولانا ابوالکلام آزاد کے ان "آثار" میں شمار کرنا چاہیے جو مختلف شعبہ ہائے حیات کے لیے ہر دور میں مشعل راہ ثابت ہوں گے!

اہم معروضات

- الہلال کے عکس کی اشاعت سات جلدوں میں کی جارہی ہے جن کی تفصیل یہ ہے :

جلد اوّل	۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء	تا	۲۵ دسمبر ۱۹۱۲ء	۲۳ شمارے
جلد دوم	۸ جنوری ۱۹۱۳ء	تا	۲۵ جون ۱۹۱۳ء	۲۴ شمارے
جلد سوم	۲ جولائی ۱۹۱۳ء	تا	۲۴ دسمبر ۱۹۱۳ء	۲۵ شمارے
جلد چہارم	۷ جنوری ۱۹۱۴ء	تا	۲۴ جون ۱۹۱۴ء	۲۱ شمارے
جلد پنجم	یکم جولائی ۱۹۱۴ء	تا	۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء	۱۸ شمارے
جلد ششم	(البلاغ) ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء	تا	۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء	۱۱ شمارے
جلد ہفتم	۱ جون ۱۹۲۷ء	تا	۹ دسمبر ۱۹۲۷ء	۲۴ شمارے

شماروں کی مجموعی تعداد ۱۴۶

- البلاغ کو تسلسل قائم رکھنے کے لیے الہلال میں شامل کرلیا گیا ہے اور اکادمی نے اس کا ذکر جلد ششم کی حیثیت سے کیا ہے۔
- الہلال کی سات جلدوں کو تین مجلّدات میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تاکہ ان کی مجموعی قیمت کچھ کم ہوجائے۔ مجلدات کی تفصیل یہ ہے

  جلد اوّل اور جلد دوم ———— ایک ساتھ مجلد ہیں
  جلد سوم اور جلد چہارم ———— ایک ساتھ مجلد ہیں
  جلد پنجم، جلد ششم اور جلد ہفتم ———— ایک ساتھ مجلد ہیں

- الہلال کا متن لائن نگیٹو سے طبع ہوا ہے؛ تصویریں ہاف ٹون نگیٹو سے چھپی ہیں۔
- کوشش کی گئی ہے کہ الہلال میں شائع شدہ سارے اشتہارات کا عکس بھی شائع ہوجائے۔
- متن میں (اور صفحات کے تسلسل میں بھی) کئی جگہ غلطیاں نظر آئیں لیکن ان کی تصحیح صرف اس لیے نہیں کی گئی کہ ہم نقل مطابق اصل کے اصول سے انحراف نہیں کرنا چاہتے۔
- بعض جلدوں کی فہرست الہلال میں شائع ہوئی تھی۔ اسے متعلقہ جلدوں کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے جن جلدوں کی فہرست الہلال نے شائع نہیں کی تھی، اسے اکادمی نے مرتب کرکے متعلقہ جلدوں میں شامل کردیا ہے۔
- یوں تو الہلال میں صفحہ نمبر کی صراحت ہوتی تھی لیکن اشتہارات صفحہ نمبر سے عاری ہوتے تھے۔ آسانی کے لیے اکادمی اڈیشن کے صفحہ نمبر کا بھی اندراج کردیا گیا ہے جو اشتہارات اور تصاویر کو بھی محیط ہے اکادمی اڈیشن کا صفحہ نمبر نیچے نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔
- الہلال کی فروخت سے اکادمی اپنی آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتی اس لیے لاگت سے کم قیمت پر فراہم کیا جارہا ہے۔